گہن
نگار عظیم

گہن

(افسانے)

'GEHAN' ---- Short Stories by NIGAR AZIM Price Rs. 100.00

Published by NIGAR AZIM , H-3, Batla House, Okhla, New Delhi-25

گہن

نگار عظیم

زیر اہتمام

بزم ہم قلم، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-۲۵

اس کتاب کی اشاعت میں اردو اکادمی دہلی کا مالی تعاون شامل ہے

انتساب

محترم عبدالعظیم صدیقی

کے نام

جن کے ساتھ نے وہ عظمت بخشی

کہ میں نگارؔ عظیم بنی

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

© نگار عظیم

نام کتاب : گہن (افسانے)

مصنف : ڈاکٹر نگار عظیم

ناشر : نگار عظیم، ایچ-۳، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-۲۵، فون: ۶۹۲۸۳۸۲

سال اشاعت : جون ۱۹۹۹ء

تعداد : چار سو

قیمت : ۱۰۰/ روپے

سرورق : کامران عظیم

کمپوزنگ : افکار کمپوزر، ذاکر نگر، نئی دہلی-۲۵، فون نمبر: ۶۸۴۴۶۰۳

زیر اہتمام : بزم ہم قلم، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-۲۵

طبع : جے۔ آر۔ آفسٹ پرنٹرز (فون نمبر:۔۳۲۶۵۱۳۸
۱۵۱۹۔ گلی کلومل سوئیوالان دریا گنج نئی دہلی۔ ۲ آفس:۔۲۳۷۵۹۶۵)

ملنے کے پتے :-

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ممبئی، علیگڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، کوچہ پنڈت، دہلی-۶
- انجمن ترقی اردو (ہند) راؤز ایونیو، دہلی۔ ۲
- تخلیق کار پبلشرز ۱۷۷۹، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، دہلی-۲
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- تنویر کتاب کونا، چوناشاہ کالونی، آزاد نگر، جمشید پور

فہرست

	عرض مصنف	
۱-	فرض	۱۳
۲-	سنگین جرم	۲۳
۳-	زندگی زندگی	۲۹
۴-	گہن	۳۵
۵-	پھانس	۴۱
۶-	کنفیشن	۵۱

۷-	زاہدہ مقدس	۶۱
۸-	جشن	۷۱
۹-	تکمیل	۷۹
۱۰-	نسبندی	۸۷
۱۱-	عکس	۹۵
۱۲-	حِصار	۱۰۳
۱۳-	لمحہ	۱۱۱
۱۴-	نگینہ	۱۱۹
۱۵-	بیل	۱۲۹

عرض مصنف

زندگی میرے نزدیک محض ایک آرٹ ہی نہیں ایک سچی حقیقت ہے، تصنع کی تمام آلائشوں سے مبرا۔ اگر زندگی کے مختلف پہلوؤں کو حقیقت نگارانہ انداز سے اور اخلاقی معیار کے دائرے میں رہتے ہوئے کہانی کا موضوع بنایا جائے تو وہ مخرب نہیں۔ حقیقت سے روگردانی نہ تو عام زندگی میں کوئی بہتر رویہ ہے نہ افسانہ نگاری میں۔ انسانی نفسیات میں پائے جانے والے خیر و شر کو زندگی کے حقائق کی شکل میں پیش کیا جائے تو اسے معیوب کیوں سمجھا جاتا ہے؟؟

میرا خیال ہے کہ کوئی بھی تخلیق کار اپنے گرد و پیش کے حالات اور سماجی انتشار سے بے چین ہو کر ہی قلم اٹھاتا ہے۔ چنانچہ میری یہ کہانیاں بھی عام انسانوں کی زندگی، ان کے مسائل، الجھنوں اور محرومیوں سے جڑی ہوئی ہیں۔

مرد اگر عورت پر ظلم کرتا ہے تو مجھے مرد پر بہت غصہ آتا ہے لیکن جب

عورت اس ظلم کو سہتی ہے اور آواز نہیں اٹھاتی تو مجھے عورت پر اس ظلم کرنے والے مرد سے بھی زیادہ غصہ آتا ہے۔ عورت عورت کے کرب کو زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے لیکن اس کے برعکس کبھی کبھی عورت ہی اس ظلم کا سبب بھی بن جاتی ہے۔

کھوکھلی اخلاقیات کی میں بالکل قائل نہیں۔ بلکہ ان کھوکھلی اخلاقیات سے باغی کرداروں میں مجھے دلچسپی ہے۔ کچھ مستند اور غیر مستند لوگوں کا خیال ہے کہ میں جنسی کہانیاں لکھتی ہوں جبکہ چوبیس سالہ قلمی زندگی میں میں نے ایک بھی جنسی کہانی نہیں لکھی۔

"گہن" میرے ادبی سفر کا نقش دوم ہے۔ نقش اول کی پسندیدگی نے ہی مجھے "گہن" مرتب کرنے کا حوصلہ بخشا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کہانیاں بھی میری پچھلی کہانیوں کی طرح آپ کے دل کی دھڑکنوں کو ضرور چھوئیں گی۔ ان کہانیوں میں اگر کسی کو جنسی تلذذ محسوس ہوتا ہے تو یہ بات یقیناً پڑھنے والے کے رجحانات پر منحصر ہے۔ ویسے بھی کسی تخلیق کا متن تیار کرنا محقق کا کام تو ہے ہی قاری کا رول اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ تنقید نگاروں کی انہیں قندیلوں سے مجھے روشنی ملی ہے۔

میں احسان مند ہوں اپنے سینے میں کلبلاتی ان یادوں کی جو والد مرحوم سے وابستہ ہیں۔ جب میں اندھیروں میں گھری ہوتی ہوں تو یہی یادیں مشعل راہ بن جاتی ہیں میں شکر گزار ہوں اپنے تمام ادبی دوستوں، ساتھیوں کی کہ انہیں کی صحبت نے میرے قلم کو مزید جلا بخشی۔ میں ممنون ہوں اپنے شوہر عظیم صدیقی اور اپنے بیٹوں کامران، سبحان، تیمور، عدنان اور حسن کی کہ وہ میری تخلیقی بے راہ رویوں کو بڑی ہنسی خوشی اور صبر سے سہہ لیتے ہیں۔

☆☆☆

فرض

فرض

پچھلے کافی دنوں سے نیلوفر بے انتہا خوش تھی۔ یہ خوشی اس سے چھپائے نہ چھپتی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سینکڑوں جلترنگ ایک ساتھ اس کے سینے میں بج اٹھے ہیں۔ وہ ہلکی ہو کر اوپر اڑتی چلی جا رہی ہے۔ ایسا لگتا تھا اونچائیوں کی طرف اڑتے اڑتے اس نے برسوں کا سفر منٹوں میں طے کر لیا ہے۔ زندگی کے سینکڑوں خواب اس نے جاگتی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔ لیکن یہ سفر اتنا مختصر ہو گا یہ اس نے سوچا ہی نہیں۔ وہ تو خوشیوں کے لئے ترس گئی تھی۔ اس لئے تھوڑی سی خوشی بھی اسے حیات جاوداں لگ رہی تھی۔

رات تقریباً آدھی بیت چکی تھی اور نیند نیلوفر کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ نیند تو اسے پچھلی کئی راتوں سے نہیں آ رہی تھی لیکن ان راتوں میں اور اس رات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ سپنے سجانے کی راتیں تھیں اور یہ غموں کو سمیٹنے

کی رات تھی۔ غم کی یہ ایک رات پچھلی خوشیوں بھری تمام راتوں پر بھاری تھی۔ نیلوفر کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اڑتے اڑتے کسی نے پکڑ کر اس کے پر کاٹ دیئے ہیں اور وہ گرتی چلی جا رہی ہے۔ نیچے ..... بہت نیچے ..... اتھاہ گہرائیوں میں .....

نیلوفر بیس برس کی تھی۔ اس کے بی ایف اے کا فرسٹ ایر تھا۔ اچانک اس کی امی کو گلے کے کینسر نے جکڑ لیا۔ آخری وقت میں ان کا بولنا بھی بند ہو گیا تھا۔ بند ہوتی ہوئی آنکھوں نے بڑی حسرت سے اپنی بڑی بیٹی صنوبر اور خاوند کی طرف دیکھا۔ اشارے سے قریب بلایا صنوبر کا ہاتھ پکڑ کر نیلوفر کے سر پر رکھوایا اور بس ..... پھر ان کا ہاتھ بے وزن ہو کر ڈھلک گیا..... اس طرح مرتے وقت انہوں نے نیلوفر کو اپنی سب سے بیٹی صنوبر کی سرپرستی میں دے کر آنکھیں موند لیں..... آپا نیلوفر کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔

دراصل بانو بیگم بڑی سوجھ بوجھ والی عورت تھیں۔ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ ان کے شوہر سید امجد علی کو کورٹ کچہری اور مقدمات سے اتنی فرصت ہی کہا ہو گی کہ وہ بیٹی کے بارے میں سوچ سکیں۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی سے فارغ ہونا بھی انہیں کی سوجھ بوجھ کا نتیجہ تھا۔ شاید انہیں زندگی کے مختصر ہونے کا علم ہو گیا تھا اسی لئے وہ نیلوفر کی شادی کے لئے کافی پریشان رہتی تھیں۔ ایسا نہیں تھا کہ نیلوفر کے رشتے نہیں تھے۔ رشتے تو بہت تھے لیکن ایک تو نیلوفر پڑھنا چاہتی تھی دوسرے وہ تینوں بہنوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور سلیقہ مند تھی۔ جب بڑی دونوں بہنیں معمولی شکل و صورت اور کم تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک سے ایک اعلیٰ گھرانوں میں بیاہی گئیں تو پھلا نیلوفر کے لئے ان سے کمتر رشتہ کیسے قبول کر سکتی تھیں۔ نیلوفر کے لئے وہ دونوں دامادوں سے بہتر داماد اور گھرانا چاہتی تھیں۔ اسی لئے ذرا دیر لگ رہی تھی۔

اب اسے حالات کی ستم ظریفی کہئے یا قسمت کا کھیل کے اِدھر بیوی کا انتقال ہوا اور اُدھر ہر وقت مصروف رہنے والے سید امجد علی کو اللہ نے اتنی فرصت سے نوازا کہ وہ مستقل طور سے گھر کے ہی ہو گئے۔ ان پر لقوے کا شدید حملہ ہوا اور وہ بستر سے لگ گئے۔ اس طرح ان کی زندگی کے شب و روز بکھر کر رہ گئے۔

ماں کی بے وقت موت سے جو سنجیدگی نیلوفر کی زندگی میں آئی تھی باپ کے اس طرح بستر پکڑ لینے سے وہی سنجیدگی اب آہستہ آہستہ بزرگواری میں تبدیل ہونے لگی۔ اس پر ذمہ داریوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بڑی آپا دہلی میں رہتی تھیں۔ اپنے بچوں اور گھر گرہستی میں بے انتہا مصروف۔ چھوٹی باجی شادی ہوتے ہی انگلینڈ جا بسی تھیں۔ وہ تو بس مرنے جینے میں ہی آتی تھیں۔ ہاں بڑی آپا تمام مصروفیات کے باوجود برابر اس کی اور ابا کی خبر گیری کرتی رہتی تھیں۔ جہاں تک ہو سکتا تھا مدد بھی کرتی تھیں۔ لیکن وہ سب ناکافی ہونے لگا۔ کیونکہ ابا کی بیماری کی مدت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ علاج میں روپیہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ جمع پونجی آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی۔ جلد ہی نیلوفر کو حالات کی نزاکت کا اندازہ ہو گیا۔ اس نے جیسے تیسے تعلیم مکمل کی اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اس چھوٹے سے شہر میں نوکری ملنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ کئی برس کی جدوجہد کے بعد ایک اسکول میں اس کی تقرری ہو گئی۔ تعلیم کا بوجھ، باپ کی تیمارداری، آنے جانے والوں کو دیکھنا، ان تمام مصروفیات نے نیلوفر کو اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ وہ اپنے بارے میں کچھ سوچ سکے۔

زندگی کے نو برس اسی جدوجہد میں گزر گئے۔ نو اس لئے کہ امی کہ انتقال کے بعد ابا نو برس زندہ رہے۔ نیلوفر کے نو برس تو مصروفیات کی نذر ہو گئے لیکن ابا کے نو برس تل تل مرتے ہوئے گزرے۔ جوان بیٹی کی ڈولی اپنے کاندھوں پر اٹھانے کے بجائے وہ خود اس کے ناتواں کاندھوں کا بوجھ بن گئے۔ ان کے گالوں کی جھریوں

میں سوکھے ہوئے آنسو ان کی بے بسی کی کہانی کہہ دیا کرتے تھے۔ بالآخر یہ خاموش کہانی بھی ایک دن ختم ہو گئی اور نیلوفر کی تمام مصروفیات بھی ..... اس کے لئے زندگی ختم ہو چکی تھی۔

وقت کی رفتار اتنی تیز تھی کہ ان نو برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ بڑی آپا دو بیٹیوں کی شادیاں کر چکی تھیں صرف نسیم رہ گئی تھی۔ بہت خوبصورت نکلی تھی۔ آپا کے بیٹا ایک ہی تھا ساحل..... وہ بھی ماشاء اللہ پندرہ برس کا ہو گیا تھا۔ چھوٹی باجی کے دو ہی بچے تھے بڑا بیٹا چھوٹی بیٹی۔ ماشاء اللہ وہ بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔ انہیں انگلینڈ کی آب و ہوا راس آگئی تھی۔ ابا کے انتقال پر خاندان کے تمام اہم افراد جمع تھے اور مسئلہ چھڑا ہوا تھا نیلوفر کے اکیلے رہنے کا..... صنوبر آپا نے بہت کوشش کی کہ وہ چل کر دہلی رہے لیکن نیلوفر ماں کا آنگن اور باپ کی یادیں چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ انگلینڈ جانے کا تو وہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی..... مجبوراً بڑی آپا کو ہی قربانی دینا پڑی ..... انہوں نے اپنے اکلوتے لخت جگر ساحل کو نیلوفر کے پاس چھوڑ دیا۔ اس دن نیلوفر کو احساس ہوا کہ بڑی آپا نے اس کے دل کے کسی کونے میں چپکے سے داخل ہو کر امی کی جگہ لے لی ہے۔

ساحل کے آجانے سے نیلوفر کی زندگی میں جہاں مصروفیات کا اضافہ ہوا وہاں اس کا اکیلا پن بھی دور ہوا۔ خالہ کی محبت اور شفقت میں ساحل کی زندگی پروان چڑھنے لگی۔ گھر میں پھر سے کچھ رونق واپس آئی اور زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگی۔ ساحل اسکول چلا جاتا نیلوفر بھی اسکول چلی جاتی اِدھر نیلوفر واپس آئی اُدھر ساحل واپس آجاتا پھر دونوں خالہ بھانجے ایک دوسرے میں ہی مصروف رہتے..... جب کبھی ساحل دہلی چلا جاتا تو نیلوفر کو اکیلے وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔

وقت کا پنچھی اڑتا رہا۔ چھ برس بیت گئے پتہ ہی نہیں چلا۔ ساحل اسکول سے نکل

کر کالج پہونچ گیا۔ دبلا پتلا شرمیلا سا لڑکا اب ایک تناور درخت بن گیا تھا۔ قد بھی ماشاء اللہ ایسا نکلا تھا کہ نیلو اتنی لمبی ہونے کے باوجود اس کی بغل میں سما جاتی تھی۔

ساحل کی مصروفیتوں میں اب تبدیلی آنے لگی تھی۔ اس کے دوستوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا تھا۔ اب ساحل کا زیادہ تر وقت گھر سے باہر ہی گزرتا۔ لیکن اپنی خالہ سے وہ کبھی غافل نہیں رہا۔

اچانک نیلوفر کی زندگی کے خاموش سمندر میں ایک تلاطم پیدا ہوا۔ نیلوفر کے دل کی دھڑکنیں اس تلاطم پیدا کرنے والے کا ساتھ دے رہی تھیں..... یہ جبار تھا..... جبار سے نیلوفر کی ملاقات اس کی ایک کلیگ عائشہ کے یہاں اس کی چھوٹی بہن کی منگنی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ جبار عائشہ کے ماموں تھے اپنی بھانجی کی منگنی پر دہلی سے تشریف لائے تھے۔ جبار ایک پرائیوٹ فرم میں سول انجینئر تھے۔ ان کی دو ہی بہنیں تھیں۔ ایک ان سے بڑی اور دوسری ان سے چھوٹی ..... بڑی تو یہی تھیں جن کی بیٹی کی منگنی تھی چھوٹی دہلی میں رہتی تھیں۔ دو سال پہلے اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ وہ بھی اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ اس تقریب میں موجود تھیں..... والدین کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ چھوٹی بہن کی تعلیم اور اس کی شادی سے فارغ ہوتے ہوتے جبار کی عمر کافی آگے نکل چکی تھی۔ لیکن اپنے مردانہ حسن، پُر وقار شخصیت اور خوش مزاجی کی وجہ سے بہت جلد نظروں میں آجاتے تھے۔

منگنی کے روز جب انہوں نے عائشہ کو بلا کر چپکے سے پوچھا کہ وہ سامنے گلابی ساڑی میں تانبے جیسی رنگت اور بادامی آنکھوں والی حسینہ کون ہے تو عائشہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ بس پھر کیا تھا..... تو چل میں آیا..... سبھی ایک دوسرے کے کان میں سرگوشی کرنے لگے..... دوسرے ہی دن ماموں جان نے پتہ نہیں کیا کھسک سے اپنی بہن کے کان میں کہا کہ گھر میں نیلوفر اور جبار کے تذکرے ہونے لگے۔

آخر کار دہلی صنوبر آپا کے یہاں نیلوفر کے لئے رشتہ پہنچ گیا۔

نیلوفر کو جب یہ سب معلوم ہوا تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا لیکن آہستہ آہستہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے دل نے جبار سے کوئی رشتہ قائم کر لیا ہے۔ اس نے خود کو آئینہ میں دیکھا..... اسے اپنے چہرے میں بہت تبدیلی محسوس ہوئی۔ اپنے سر میں چمکتے چاندی کے کئی تار اس دن نیلوفر کو بہت بھلے معلوم ہوئے۔ اسے لگا جیسے صرف یہی بال تو ہیں جو اس کی برسوں کی ریاضت کے گواہ ہیں۔ یوں تو نیلوفر کی عمر پینتیس کی ہو گئی تھی۔ لیکن اب بھی اس کی آنکھوں کے شرمیلے دیئے جدھر دیکھتے تھے ایک رشتہ قائم کر لیتے تھے۔ کسی کی چاہت نے ان کی روشنی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی زندگی کا ٹھہراؤ اس کا حسن بن گیا تھا۔ اس کی ریاضت اس کی معصومیت بن گئی تھی لیکن اس معصومیت کے پجاری کو سخت ٹھیس پہنچی جب اسے معلوم ہوا کہ نیلوفر نے اس رشتہ سے انکار کر دیا ہے۔ جبار کا دل ٹوٹ گیا۔ ان کا پہلا تجربہ آخری ثابت ہوا۔ انہوں نے پسند کرنے میں کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ نیلوفر کی آپا اور جبار کی بہن دونوں نے جبار کے ٹوٹے دل کو جوڑنے کی کوششیں کیں۔ سمجھایا بجھایا۔ ایک سے ایک خوبصورت لڑکیوں کے تذکرے کئے گئے..... ایک دو لڑکیوں کو دکھایا بھی گیا۔ نیلوفر پر کئی مرتبہ لعنت پڑھی گئی..... نتیجہ اچھا برآمد ہوا۔ جبار کا رشتہ آخر صنوبر آپا کی تیسری بیٹی نسیم سے طے ہو گیا۔ نیلوفر نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ایک دن پہلے عائشہ کے جس مذاق کو اس نے مسکرا کر ٹال دیا تھا دراصل وہ مذاق نہیں اس پر کسا ہوا طنزیہ فقرہ تھا۔ عائشہ نے کہا تھا "تمہارے دماغ اور نخروں کی یہی حالت رہی تو ساری عمر کنواری ہی بیٹھی رہو گی۔" طنز سے بھرا جملہ اس وقت نیلوفر کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح پڑ رہا تھا۔ نیلوفر نے اپنے بالوں میں انگلیاں ڈالیں اور مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کے سر کا تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ نیلوفر نے

بے چینی سے پھر کروٹ بدلی۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ سوچتے سوچتے دماغ شل ہو گیا تھا۔ لیکن اس بات کا جواب اسے کہیں نہیں مل رہا تھا کہ آخر اس کی صنوبر آپا نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے اتنا بڑا جھوٹ آخر کیوں بولا؟ کیوں؟ آخر کیوں؟؟ ساحل نے دہلی سے آکر جس صفائی سے ایک ایک بات اسے بتائی تھی وہ اس کے دل کو چیرے ڈال رہی تھی۔ جبار کے ساز و سامان سے آراستہ خوبصورت بنگلے اور باپ دادا کے باغات اور جائداد نے صنوبر آپا پر ایسا جادو کر دیا تھا کہ وہ اپنی بہن کے تئیں اپنے تمام فرائض بھول گئیں۔ نیلوفر کے سر پر رکھا ہوا ہاتھ بھی بھول گئیں..... یہ بھی بھول گئیں کہ وہ آخرت میں امی کو کیا جواب دیں گی۔

ساحل نے تو یہ بھی بتایا کہ امی کہتی تھیں ایسا لڑکا تو ہماری نسیم کے لئے ہونا چاہئے تھا۔ نیلوفر بیچاری اب اس عمر میں شادی کر کے کیا کرے گی..... اور تبھی سے انہوں نے جبار کو اور اس کی بہنوں کو شیشے میں اتارنا شروع کر دیا..... نیلوفر کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ساحل نے اسے یہ بتایا کہ امی اس کی شادی کرنی ہی نہیں چاہتیں..... ان کی نگاہ اس کے تمام زیورات، فنڈ اور اجدادی مکان پر ہے..... ساحل نے یہ بھی بتایا کہ امی نے اس کے اخراجات سے بچنے اور آپ کی زندگی کے شب و روز پر نگاہ رکھنے کے خیال سے اسے چھوڑا تھا۔ نیلوفر کو پاگل کر دینے کے لئے یہ باتیں کافی تھیں۔ نیلوفر نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ اے خدا یہ تیرا کیسا انصاف ہے؟ آخر اس کا قصور کیا ہے؟ اس نے تو تمام زندگی فرض کی بھینٹ چڑھا دی اور کبھی شکوہ نہ کیا لیکن یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ زندہ رہنے کا یہ قرض آخر وہ کب تک ادا کرے گی؟ کب تک؟

یکایک نیلوفر کی سسکیاں رک گئیں..... اپنے کاندھے پر اسے کسی بھاری ہاتھ

کا احساس ہوا..... اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ بیٹھی..... رووٴ مت خالہ..... رووٴ مت..... تمہاری خوشیاں تمہیں ضرور واپس ملیں گی..... ساحل نے جان سے عزیز خالہ کو اپنے سینے سے لگالیا..... کسی بزرگ کی طرح وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

مدتوں بعد کسی کا شفقت بھرا ہاتھ نیلوفر کے سر پر رکھا گیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی..... اسی وقت ساحل نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اپنی ماں کا فرض اور خالہ کی زندگی کا قرض اب وہ خود ادا کرے گا.....

☆☆☆

سنگین جرم

سنگین جرم

لوگوں کا خیال تھا کہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی دس پندرہ دن میں حالات معمول پر آجائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بیس دن گذر جانے کے بعد بھی ہواؤں کا زور بڑھتا ہی جارہا تھا۔ پچاس پچاس برس سے رہنے والے لوگ اپنے اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ دونوں فریقین کو پکا یقین تھا کہ یہ سب عارضی ہے۔ کچھ دن گذر جانے کے بعد ہواؤں کا رخ بھی بدل جائے گا اور وہ پھر اپنے آشیانے آباد کریں گے۔

حاجی عبدالودود ریٹائرڈ ڈی سی پی اپنے جدی مکان میں پچھلے تین برس سے فالج زدہ پڑے تھے۔ ان کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو گئی تھیں۔ چھوٹے سے خاندان میں بیوی اور تین بیٹیوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

پہلی بیٹی حسین دوسری امرین اور تیسری آفرین۔ حسین ۲۳ سال کی تھی بی اے

بی ایڈ کے بعد مقامی اسکول میں ٹیچر ہو گئی تھی۔ پچھلے برس اس کی منگنی بھی ہو گئی تھی۔ انتظار اس بات کا تھا کہ امرین کی ملازمت لگ جائے تو حسین کی شادی کر دی جائے۔ امرین نے آرکیٹکٹ کا ڈپلومہ کیا تھا ان دنوں نوکری کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

آفرین چودہ برس کی تھی نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ حاجی جی اور ان کی بیگم اونچے خاندان، اچھی شکل و صورت اور عمدہ شخصیت کے مالک تھے۔ اس لئے لڑکیاں بھی ماشاء اللہ ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ لیکن حاجی صاحب کو اس بات کا کوئی غم نہیں تھا۔ اپنی نوکری کے دوران تو انہیں معلوم ہی نہیں چلا کہ وقت کب اور کیسے گذر گیا۔ جب سے بیمار ہوئے تھے ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔

سات دسمبر سے فساد شروع ہوا تو گھر میں راشن پانی ڈال کر بے فکر ہو گئے۔ مکان چھوڑ کر بھاگنے کا خیال انہیں کبھی نہیں آیا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن تھے لیکن بیوی اور بیٹیاں اس فساد سے کافی پریشان اور خوفزدہ تھیں، کیونکہ کئی روز سے رات کے گھپ اندھیرے میں آگ کے بھڑکتے شعلے دیکھ کر ایسا لگتا کہ یہ شعلے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔ اللہ اکبر - ہر ہر مہادیو- جے بجرنگ بلی کے نعروں سے ماحول ایسا خوفناک ہو جاتا کہ مکان کے در و دیوار سے بھی دہشت برسنے لگتی۔

بیگم صاحبہ اور تینوں بیٹیاں حاجی جی کے ارد گرد ہی منڈلاتی رہتیں۔ جب کبھی فائر بریگیڈ کی ٹن ٹن سنائی دیتی تو ماحول اور حولناک ہو جاتا۔ ایسے میں خود بہ خود کسی نہ کسی کے قدم چھت کی طرف اٹھ جاتے اور آنکھیں کسی نہ کسی روزن سے باہر کا خوفناک منظر دیکھنے لگتیں۔ اب دو دن سے سب کچھ خاموش تھا۔ چاروں طرف قبرستان کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بیٹیاں باپ کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی

رہتیں۔ فائر بریگیڈ کی آواز بھی اب آنا بند ہو گئی تھی۔ بجلی اور ٹیلی فون کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ رات کے اس خوفناک سناٹے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی اب مدھم پڑ گئی تھیں۔ بیوی اور بیٹیوں کے پیلے چہرے دیکھ کر حاجی جی کے چہرے کا اطمینان بھی چغلی کھانے لگا تھا۔ شاید وہ خطرے کو بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی بیگم کو مشورہ دیا کہ رات کی خاموشی میں تینوں بیٹیوں کو وہاں سے نکال لے جائیں۔ ان کی آواز رندھ گئی--- "میں یہیں پڑا رہوں گا-- حالات درست ہو جائیں گے تو---" ان کی بات بیچ میں ہی رہ گئی-- کہ حسین بھاگی ہوئی آئی-- وہ بری طرح ہانپ رہی تھی-- امی وہ سب ادھر ہی آ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں، بندوقیں ہیں، وہ بہت سارے ہیں۔ اب کیا ہو گا ابا؟ تینوں بیٹیاں باپ سے چپٹ کر رونے لگیں۔ ماں نے دروازے کی جھری سے باہر جھانک کر دیکھا۔ نکل بھاگنے کا موقع بھی نہ تھا۔ اتنی ہی دیر میں دھڑ دھڑا دھڑ ..... دھڑ دھڑ ..... دروازہ پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چوکھٹ کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ سب ادھر ادھر بھاگ کر چھپنے لگے۔ دروازہ زوردار دھڑام کی آواز کے ساتھ اندر کی طرف گر گیا-- ایک جم غفیر مکان کے اندر داخل ہوا۔ پل بھر میں ہی وہاں کی ہر چیز بدل گئی۔ حاجی جی نے ہاتھ جوڑ کر لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "بھائی جو کچھ تمہیں لینا ہے لے لو-- آگ نہ لگاؤ۔"

پولیس کی وردی میں کئی لوگوں کو دیکھ کر حاجی جی بولے "میں بھی تمہاری ہی طرح..... چپ بڈھے-- لیکن جیسے ہی کسی نے بڈھے پر ٹارچ سے روشنی ڈالی تو انہیں بڈھے کے پیچھے کوئی کلبلاتا ہوا محسوس ہوا۔ انہوں نے کالی گھٹاؤں جیسے بالوں کو پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا۔ بے ترتیب بالوں میں سے ایک خوبصورت چاند چمکا--- جس کی چاندنی پیلی پڑ چکی تھی۔ حاجی جی گڑگڑائے-- یہ میری بیٹی ہے--- میری بیٹی ہے یہ-- تم سب کچھ لے لو-- سب کچھ-- لیکن اسے----" باپ کے گڑگڑانے کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی۔ آفرین کی چیخیں اندر ہی اندر گھٹ کر اب بند

ہو گئیں-- پہلے ایک-- پھر دوسرا-- پھر تیسرا--اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا---
نہ معلوم کب تک--

طوفان تھما تو ادھر ادھر سے چھپی ہوئی حسین، امرین اور ماں باہر نکلے--
پلنگ سے باہر لٹکا ہوا باپ کا مردہ جسم دیکھ کر بھی کسی کا آنسو نہیں نکلا-- آفرین
کے تن پر ایک چیتھڑا بھی نہیں تھا۔اس کی نچی کھسٹی لاش نہ صرف داغدار تھی بلکہ
ایسا لگتا تھا جیسے جنگلی جانوروں نے اس کے پورے جسم کو بھنبھوڑ ڈالا ہے۔ کئی دن
تک تینوں ماں بیٹیاں گڈھے کھود کھود کر دونوں لاشوں کو دفناتی رہیں۔ ہر ایک کی
زبان گنگ تھی۔ کوئی کسی سے نہ بولتا تھا۔ نہ کوئی کھاتا تھا نہ پیتا تھا۔ تین دن اسی
سناٹے کے عالم میں قہر کی طرح سے گذر گئے۔ چوتھے دن پھر ہنگامہ سنائی دیا---
اڑوس پڑوس کے مکانات سے دھواں اٹھ رہا تھا شاید ان مکانوں کے تمام افراد یا تو
لقمۂ اجل بن گئے تھے یا بھاگ گئے تھے۔یا پھر زندہ یا مردہ ان مکانوں میں جل رہے
تھے۔ ضرور ان کے مکان کی بھی باری آئے گی۔ لوٹ کھسوٹ کے بعد اب آگ
زنی کا دور شروع ہوا تھا۔ وہ رات تو آنکھوں آنکھوں میں گذر گئی---دوسرے دن
شام کو ٹوٹے دروازے سے ایک بھیڑ پھر اندر داخل ہوئی--ابھی وہ ڈیوڑھی بھی پار
نہ کر پائے تھے کہ ٹھائیں ٹھائیں کی آواز ہوئی اور اندر داخل ہونے والے لوگوں میں
سے ایک کے بعد ایک دو تین گر پڑے۔ حملہ آوروں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ وہ واپس
بھاگنے لگے۔ حسین کے ہاتھوں میں باپ کی بندوق تھی۔اور وہ نشانہ تانے دالان کی
چھت پر کھلنے والی کھڑکی کے درمیان کھڑی تھی۔ دنا دن پولیس کی گاڑیاں آ گئیں--
تین افراد کے قتل کے الزام میں تینوں ماں بیٹیوں کو گرفتار کر کے گاڑی میں لے
گئیں-- کیونکہ جرم بہت سنگین تھا۔

☆☆☆

زندگی زندگی

زندگی زندگی

وہ دونوں سمجھدار تھے، پڑھے لکھے تھے، زندگی کے فیصلے انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر کئے تھے، دونوں ہی اچھے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کی پسندیدگی کو دونوں گھرانوں کے بزرگوں نے قبول کر لیا تھا۔ ایک سال قبل ثریا کو انگوٹھی پہنا کر منگنی کی رسم ادا کر دی تھی اور اب شادی کی تیاریاں بہت زور شور سے ہو رہی تھیں۔ مانجھے کا دن تھا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ثریا کو زعفران میں رنگے کپڑے پہنائے گئے، ابٹن لگایا گیا، گود بھری گئی، خوب خوب بابل کے گیت گائے گئے، سہیلیوں نے سرگوشیاں کیں، وہ دھما چوکڑی مچی کہ بس توبہ بھلی۔ سہیلیوں کا غول کا غول کبھی عارف کے گھر جا دھمکتا تو کبھی ثریا کو گھیرے میں لے لیتا، کبھی ابٹن کے بہانے کبھی مہندی کے بہانے خوب خوب مذاق ہوتے۔ ایک دوسرے کے نام سے دونوں کو شرارت بھرے پیغام پہنچائے جاتے اور مزے لئے جاتے۔ یہ سارے پیغام دولہا دولہن

کے کم ہوتے عارف کے دوستوں اور ثریا کی سہیلیوں کے زیادہ ہوتے۔

ہفتہ بھر سے یہی سرگرمیاں زور پکڑے ہوئے تھیں، گلگلے پکائے گئے، رت جگے منائے گئے، ڈھولک کی تھاپ پر ایسے ایسے گیت گائے گئے کہ خدا کی پناہ-- ساری ساری رات سہاگ اور سہرے بنّے اور بابل کے گیت گائے گئے۔ ایک مکھڑا پورا نہ ہوتا کہ دوسرا شروع ہو جاتا۔ جوان لڑکے جھانک تانک سے باز نہ آتے، اور لڑکیاں بھی کم بخت خود کو چھپانا کہاں چاہتیں۔

برات میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا کہ اچانک ثریا کو بخار ہو گیا۔ ریاست یار خاں اپنی اکلوتی بیٹی ثریا کے لئے پریشان ہو اٹھے۔

کیا ہوا ڈاکٹر میری بچی کو؟

ارے کچھ بھی نہیں-- معمولی بخار ہے--بس ذرا آرام کریں اور یہ دوا لے لیں..... بس اتنا کہنا تھا کہ ریاست یار خاں کے حکم کے مطابق حویلی میں سناٹا چھا گیا۔ ثریا کی طبیعت خراب ہے اسے آرام کی ضرورت ہے۔

کریمن بوا-- پاشا بوا-- رجو بوا سبھی بڑبڑائیں۔ اے ستیاناس کمبخت نگوڑی ماریوں کا۔ بٹیا کو سونے ہی کہاں دیا ہے۔ کتنی راتیں ہو گئیں ڈھول ڈھپڑے بجاتے بجاتے، یہ تک نہ سوچا بٹیا پر کیا بیتے گی۔ حویلی میں سناٹا کیا ہوا سب کو آرام کرنے کی مہلت مل گئی۔ سب تھکے ماندے تھے جو جدھر پڑا سو گیا۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب رات کا دوسرا پہر بیت گیا۔

امی-امی-امی میرا دم گھٹا جا رہا ہے ثریا کی آواز سے اس کی امی کی آنکھ کھلی وہ تیزی سے اپنی لخت جگر کے قریب پہنچیں ماتھا چھو کر دیکھا تو برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ لیکن پھر یہ گھبراہٹ کیوں؟؟

امی خدا کے لئے کچھ کیجئے میرا دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔ پورے گھر میں بھگدڑ مچ گئی اور پھر آہستہ آہستہ سب کو محسوس ہوا کہ یہ گھٹن صرف ثریا کو ہی نہیں سب

کو ہو رہی ہے۔ کھڑکی دروازے کھول دیئے گئے۔ رات کا دھندلکا ابھی باقی تھا۔ دور کہیں شور اور ہنگامہ سنائی دے رہا تھا۔ اور پھر اچانک سائرن--- سائرن--- یعنی خطرہ--- کس طرح کا خطرہ؟؟ سائرن کی آواز کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہی تھی۔ ہر طرف ہنگامہ- فساد نہیں، خانہ جنگی نہیں۔ ریاست یار خاں باہر نکل کر ایک ایک سے پوچھ رہے تھے لیکن کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں کہ کیا ہو گیا۔ جدھر سے سائرن کی آواز آرہی تھی لوگ اسی طرف دوڑتے جارہے تھے۔ دور جھگی جھونپڑیوں کے قریب ایک فیکٹری سے سائرن دہاڑ رہا تھا۔ اس فیکٹری کی چمنیوں سے ہمیشہ سنہرا سنہرا دھواں نکلا کرتا تھا۔ وہاں سے زہریلی گیس نکل کر ہوا میں تحلیل ہو رہی تھی اور اس کے اثرات نے سب کو جکڑ لیا تھا۔

لوگ چلا رہے تھے بھاگو بھاگو- شہر سے دور بھاگو فیکٹری سے دور بھاگو۔ اور پھر ہزاروں افراد دوسری سمت بھاگنے لگے۔ کتنے ہی چکرا کر گر پڑتے تھے کچھ بے ہوش ہو جاتے تھے کچھ اٹھ کر پھر بھاگنے لگتے تھے اور پھر بھاگو بھاگو کی آواز کا یہی شور بڑھتا چلا گیا۔ کہیں دور اعلان ہو رہا تھا آنکھوں کو بچاؤ- الٹے لیٹ جاؤ- کھڑکی دروازے بند کر لو--- دیکھتے ہی دیکھتے پورا شہر شمشان بن گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں بچے اور بوڑھے کچل کر مارے گئے۔ سیکڑوں گھروں میں ہی گھٹ گھٹ کر دم توڑ گئے۔ جو بھاگ نہیں سکتے تھے انہوں نے اپنے بچوں کو آگے بھگا دیا خود سسکتے رہے۔ گیس کے زہریلے پن نے کھانے پینے تک کی اشیا کو زہریلا کر دیا تھا۔ غرض یہ کہ شہر کے باہر لاکھوں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ پو پھٹ چکی تھی اور شہر بھر کا برباد، ویران، منظر اور اجاڑ آنکھوں کے سامنے تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ایک ہی رات میں اس پورے شہر کو کسی آسیب نے گھیر لیا ہے۔

عارف ثریا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکا تھا۔ اس نے ثریا کی حویلی سے لے کر شہر کے آخری کونے تک ثریا اور اس کے گھر کے تمام افراد کو چھان مارا لیکن کہیں ان کا سراغ نہ ملا۔ اس چکر میں وہ خود بھی اپنے ماں باپ سے بچھڑ گیا۔ اب اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں اس میں چلنے کی سکت اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔

ایک دن اور ایک رات گذر چکی تھی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ لوگ بھوکے پیاسے تڑپ رہے تھے۔ سرکاری انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹروں کی ٹیمیں اپنے اپنے کام میں مصروف تھیں۔

اس نے پھر ہمت جٹائی اور اپنی کپکپاتی ٹانگوں سے آگے بڑھا۔ ایک ریلیف کیمپ، دو، تین اور پھر وہ ایک دم چیخ پڑا--- ثریا--- کئی ڈاکٹر اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اور وہ چیخے جا رہی تھی۔ مجھے دکھائی نہیں دے رہا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ ثریا کے قریب پہنچتے پہنچتے عارف لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا اس نے مضبوطی سے ثریا کا ہاتھ تھام لیا۔ ایک قیامت تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی ہر کوئی کسی نہ کسی کے لئے رو رہا تھا اور کہیں کہیں تو رونے کے لئے بھی کوئی نہیں بچا تھا۔ عارف اپنے ماں باپ کو کھو چکا تھا۔ ثریا کے والد ریاست یار خاں کی لاش وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ثریا کی آنکھیں اپنا حسن کھو چکی تھیں۔ خود اس کی ٹانگیں گیس کے اثرات سے لڑتے لڑتے ہار گئی تھیں۔ ایک ہفتہ بیت گیا تھا حالات ایسے تھے کہ ہر پل اموات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں پر ویرانیاں تھیں۔ آنکھیں سوکھ چکی تھیں۔ ثریا اور عارف دونوں ایک دوسرے کی نظروں میں سوالیہ نشان بن گئے تھے۔ لیکن وقت کے ہاتھوں دھیرے دھیرے انہیں احساس ہوتا گیا کہ اب بھی وہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔

لہٰذا دونوں نے ایک دوسرے کا مرہم بننے کی کوشش کی۔ تھرتھراتے ہاتھ پھر ایک دوسرے کی طرف بڑھے لیکن اب ان میں جواں دلوں کی سرگوشیوں کی بجائے آنسو اور سسکیاں شامل تھیں۔ حسبِ معمول ایک صبح عارف اور ثریا لان میں بیٹھے تھے کہ اچانک عارف کی نظر کیکٹس میں کھلے ہوئے پھول پر پڑی۔ کتنا خوبصورت پھول کھلا تھا۔ شاید پہلی بار..... عارف نے اپنا ہاتھ ثریا کے ہاتھ پر رکھ دیا..... زندگی زندگی سے گلے مل رہی تھی ایک موہوم سی امید نے ان میں امنگ بھر دی تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ان کی محبت سے کوئی ایسا پھول ضرور کھلے گا جو دونوں کی محبت کی یادگار بن جائے گا۔ ☆☆☆

گہن

گہن

ستارہ چلی گئی اور نازش کا جیسے سارا چین سکون لے گئی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اسے نہ صرف ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا بلکہ ذلیل بھی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا وجود دھنی ہوئی روئی کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر اڑ رہا ہے۔ ستارہ ایک رنڈی کی اولاد اسے نہ صرف بہت موٹی اور غلیظ گالی دے گئی ہے بلکہ محبت سے لبریز اس کے تمام وجود پر تیزاب انڈیل گئی ہے۔ اپنی اتنی بڑی ہتک سے وہ تڑپ اٹھی۔

جب سے ماڈرن فیشن ہاؤس کا ایک گوشہ خواتین کے لئے مخصوص ہوا تھا فیشن ہاؤس کی رونق دوگنی ہو گئی تھی۔ نئی طرز کے لباس نے عورتوں کے دل موہ لئے تھے۔ بھاری زری، زردوزی، لکھنوی چکن، خوبصورت کڑھائی، جدید فیشن اور مناسب قیمت نے ماڈرن فیشن ہاؤس کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ لباس کے جدید اور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی تراش خراش نے کئی

معمولی جسموں کو داد طلب بنادیا تھا۔ ان تمام کاموں کی انچارج نازش تھی۔ جو پچھلے آٹھ دس برس سے یہی کام اپنے گھر پر کر رہی تھی۔

یوں تو نازش بہت معمولی صورت شکل کی مالک تھی لیکن اپنے حسن اخلاق سے وہ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنالیتی تھی۔ گھر کی پرانی شاگرد ائیں اور سہیلیاں تو ایک طرف ان دو برسوں میں جس تیزی سے نازش کی نئی شاگردوں اور سہیلیوں کا اضافہ ہوا تھا اس نے نازش کو بھرپور اعتماد بخشا تھا۔ نازش کے کام سے نہ صرف فیشن ہاؤس بلکہ نازش کا نام بھی خواتین کی زبان پر آنے لگا تھا۔

نازش کے محنتی اور خوش مزاج ہونے کا چرچا گھر سے باہر جتنا زیادہ تھا گھر کے اندر معاملہ بالکل برعکس تھا۔ گھر والے اس کی شہرت سے بے نیاز اس بات پر نالاں تھے کہ وہ عمر کس کے لئے بتا رہی ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، اصل وجہ تو بس نازش ہی جانے۔

ادھر کچھ دنوں سے نازش کی سہیلیوں میں ایک نئی سہیلی ستارہ کا اضافہ ہوا تھا۔ کیا حسین تھی، جب بھی ماڈرن فیشن ہاؤس میں اس کے قدم آتے چاروں طرف رونق ہی رونق بکھر جاتی۔ نازش گرم گرم پکوڑے چائے اور سموسے منگاتی اور خوب اس کی خاطر مدارات کرتی۔ کام کے ساتھ ساتھ بڑی خاموش سرگوشیاں ہوتیں۔ نہ جانے کتنی آنکھیں ستارہ کے دیدار کے لئے بے چین رہتیں۔ خود فیشن ہاؤس کا مالک احتشام اپنی عمر کا خیال کئے بغیر کنکھیوں سے ستارہ کا دیدار کرتا اور مسکراتا۔ باتوں باتوں میں نازش کو معلوم ہوا کہ ستارہ اپنے زمانے کی مشہور طوائف چاندنی بائی کی بیٹی ہے۔ ستارہ کی بول چال انداز بیان حسن و اداؤں میں اپنے ماحول کا عکس صاف جھلکتا تھا۔ اور نازش کو مزاجاً ان سب باتوں سے گہری دلچسپی تھی۔ آہستہ آہستہ دونوں کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔

ستارہ نازش کے گھر آئی تھی۔ گرم گرم پکوڑے خوب چٹنی لگالگا کر کھائے گئے تھے۔ خوب گپ شپ ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں باتوں کا رخ بھی موڑا گیا۔ نازش نے ایک بہت خوبصورت ستاروں اور موتیوں سے جڑا کامدار بلاؤز ستارہ کو تحفے میں دیا۔

اتنا خوبصورت..... خوشی اور حیرت کے ملے جلے اثرات سے ستارہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

میرے لئے؟؟ تم کتنی اچھی ہو نازش..... ہائے..... دل چاہتا ہے تمہیں چوم لوں..... اور ستارہ نے سچ مچ نازش کی کولی بھر کر اس کا گال چوم لیا..... بلاؤز کو ہاتھوں میں نچا نچا کر ستارہ اس کی خوبصورتی کی تعریف کر رہی تھی۔

کم از کم پہن کر تو دکھاؤ۔

سچ..... ابھی لو..... پہلے اپنا منہ ادھر کرو.....

پیٹھ پھیر کر ستارہ نے قمیض اتاری..... بلاؤز پہنا..... ہک لگائے..... اس کے جسم کی خوبصورتی ایک دم نمایاں ہو گئی تھی۔ بلاؤز کی فٹنگ نے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ اس نے کئی زاویوں سے خود کو آئینہ میں دیکھا۔ نازش کی پسند کی داد دی اور خود نازش کو داد طلب نظروں سے دیکھا۔ نازش مسکرا رہی تھی۔

ستارہ نے پیٹھ پھیر کر پھر اسی طرح بلاؤز اتار کر ایک طرف رکھا اور قمیض پہننے لگی..... یکایک..... اوئی..... کہہ کر ستارہ اچھل پڑی۔ اچھل کر بے خیالی میں پلٹی تو وہ پوری کی پوری نازش کے سامنے تھی۔ یہ کیا بے ہودہ مذاق ہے.....؟؟ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا.....؟؟ نازش پر مدہوشی طاری تھی اور ستارہ کسمسا رہی تھی۔ اپنے جسم کو چھپاتے ہوئے ستارہ نے خود کو نازش سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ ستارہ نے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ نازش کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح ایک طرف بیٹھ گئی اور ستارہ جلدی قمیض پہننے لگی۔ مارے غصہ کے جو اس کے

منہ میں آیا بڑبڑاتی چلی گئی۔ کمبخت، مردار، تیری ہمت کیسے ہوئی؟ کیا سمجھا تھا تو نے مجھے؟ یہ آگ میں نہیں کوئی اور ٹھنڈی کرے گا---- سمجھی..... کسی مرد کو پکڑ ----مرد کو---زناخی کہیں کی----- قدرت کے اصولوں سے لڑے گی تو بے موت ماری جائے گی---- یہ لے اپنا بلاؤز---- کسی اور کو دینا----- بلاؤز نازش کے منہ پر پٹخ کر ستارہ کھٹ کھٹ سیڑھیاں اترتی ہوئی یہ جا اور وہ جا----

☆☆☆

پھانس

پھانس

سترہ برس سے جو آگ انتظار بیگ کے سینے میں دہک رہی تھی وہ اس طرح بجھے گی ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی اس حادثے کو وہ اپنی زندگی سے نکال نہیں سکے تھے۔ ایک پھانس سی تھی جو لمحہ بہ لمحہ اندر ہی اندر انہیں کلتی رہتی تھی۔ آج اچانک اپنے سامنے پروین کو دیکھ کر وہ خود کو روک نہ سکے۔ سترہ برس سترہ لمحے بن کر ان کی آنکھوں سے گذرے جا رہے تھے کہ ان کو ضائع کئے بغیر وہ بہت تیزی سے اٹھے اور ایک ہی پل میں اپنا اگلا پچھلا تمام حساب چکتا کر دیا۔

مرزا انتظار بیگ چار بہنوں اور پانچ بھائیوں کے بعد دسویں اور آخری نمبر پر تھے۔ آخری بیٹے کی شادی کا ارمان دل میں ہی لئے اماں رخصت ہو گئی تھیں۔ حالانکہ انتظار بیگ کو ایسا لگتا تھا کہ یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ نو اولادوں کی شادیاں کرنے کے بعد بھلا اب دسویں شادی کا ارمان کس کو ہو گا؟ اب تو ماشاءاللہ اماں کے

نواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں بھی شادی کے لائق ہونے لگے تھے۔

مرزا انتظار بیگ کچھ تو طبیعتاً شرمیلے تھے۔ کچھ سب سے چھوٹے ہونے کی وجہ سے ذرا دبو سے رہ گئے تھے۔ بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ سب دور دور رہتی تھیں۔ مہمان بطور آتیں تو بھی اپنے ہی بچوں میں گھری رہتیں۔ بڑے بھائیوں میں اور انتظار بیگ کی عمر میں بہت فرق تھا۔ ان کے رعب اور دبدبے سے انتظار بیگ سہمے سہمے سے رہتے تھے۔ بھابیاں ہمیشہ کسی نہ کسی کام سے ہی انہیں یاد کرتی تھیں۔ جب سے ابا میاں تھانیداری سے ریٹائر ہوئے تھے گھر کا ماحول اور بھی بدلا بدلا سا ہو گیا تھا۔ انتظار خود کو فالتو سا محسوس کرتے۔ ان تمام حالات سے انتظار نے بظاہر تو سمجھوتا کر لیا تھا لیکن اندر ہی اندر وہ گھٹتے رہتے تھے۔ جیسے تیسے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئے۔ بظاہر وہ خوش شکل اور خوش مزاج تھے۔ کئی مرتبہ انتظار کی شادی کے چرچے ہوئے لیکن بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی۔ انتظار نے بھی اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں دکھائی۔ دراصل ان کی پرورش اور ماحول نے انہیں ایک ایسے خول میں بند کر دیا تھا جہاں صرف ان کا ظاہر نظر آتا تھا۔ باطن میں جھانکنے کی کسی کو فرصت بھی نہیں تھی۔ بلکہ اب تو کچھ دنوں سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جب بھی شادی کا ذکر ہوتا تو انتظار کچھ چڑھ سے جاتے۔ شاید اس لئے کہ صرف ذکر سے تو شادی ہونے سے رہی۔ جب بھی کہیں رشتہ چلتا تو لڑکی کا دیکھنا بھی ایک مسئلہ بن جاتا۔ کسی کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔ کسی کی طبیعت خراب ہے۔ کسی کے بچوں کے امتحان ہیں۔ کہیں کوئی آنے والا ہے اور کہیں کوئی جانے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔

غرض ہر ایک کی کوئی نہ کوئی مجبوری نکل آتی۔ کوئی بھی یہ ذمہ داری اپنے سر لینے کو تیار نہ ہوتا۔ انتظار تو حیران ہوتے تھے کہ گھر میں اتنی شادیاں کیسے ہو گئیں؟

صرف ایک اماں کے نہ ہونے سے ان کی شادی کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے۔ انتظار کے سب ساتھی بال بچوں والے ہو چکے تھے۔ اکثر و بیشتر انتظار کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ انتظار بیگ آہستہ آہستہ اپنی شادی کے بارے میں بھولتے جا رہے تھے۔ عمر بھی اب پینتیس کی ہو چکی تھی۔ لیکن ایک دن منجھلی باجی نے کوئی لڑکی بتائی اور پھر سے شادی کا ذکر چھڑ گیا۔ لڑکی کی خوبصورتی کا ذکر ہر روز ہونے لگا۔ رنگ کیسا گلابی گلابی ہے۔ ناک نقش بڑے تیکھے ہیں۔ پلکیں کیسی لمبی لمبی اور گھنی گھنی ہیں۔ اور قد تو بس ایسا ہے کہ اپنے ہی خاندان کی لگے گی۔ یا اللہ -- بال کتنے لمبے ہیں -- اتنی لمبی کمر ہے لیکن چوٹی -- اس سے بھی دو مٹھی نیچے لٹکتی ہے۔ چلتی ہے تو چوٹی ناگن کی طرح لہراتی ہے --- سب کے فقرے سنتے سنتے انتظار بیگ کو لگتا جیسے یہ ناگن سی چوٹی لڑکی کی کمر کے بجائے ان کے سینے پر لہرا رہی ہے۔ اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ پروین دلہن بن کر گھر آ گئی۔ اسے دیکھ کر انہیں لگا کوئی آسمانی حور بھولے بھٹکے اس دنیا میں اتر آئی ہے۔ پہلی ہی نظر میں وہ دلہن کے حسن کے دیوانے ہو گئے۔ اس حسن کے لئے تو پینتیس برس کیا وہ تمام عمر انتظار کر سکتے تھے۔ انہیں اپنی منجھلی باجی کی پسند پر بڑا ناز ہوا۔

ادھر انتظار بیگ اپنی دلہن کے حسن میں محو تھے ادھر لوگ شادی کی چہل پہل، رت جگے، ہلدی، ابٹن، مانجھا اور برات، آرسی مصحف، کھیر چٹائی اور چوتھی کے ہنگاموں کا ذکر بڑے چٹخارے لے لے کر کر رہے تھے۔ مرغ مسلم، بریانی، شیر مال، کباب اور نان کے ذائقے بھی ابھی بھول نہیں پائے تھے کہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی طرح چٹ دلہن آئی اور پٹ گئی پر سب ہکا بکا رہ گئے۔

چوتھی کی دلہن اپنے گھر کیا گئی کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیا۔ جنگل کی آگ کی طرح یہ بات سارے خاندان میں پھیل گئی۔ جتنے منہ اتنی باتیں -- سب کی سوالیہ

نظریں انتظار بیگ کی طرف اٹھنے لگیں۔ بھائیوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ کوئی ایسی ویسی بات تھی تو اتنا سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے بتادیا ہوتا۔ ارے شادی کو منع کر دیتا۔ کسی نے زبردستی تو نہیں کی تھی۔ یوں بدنامی کا سامنا تو نہ کرنا پڑتا۔ انتظار بیگ کسی کی بات کا کیا جواب دیتے۔ وہ تو مارے شرم کے پانی پانی ہوئے جارہے تھے۔ انہیں تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سر عام انہیں ننگا کر دیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھی انتظار نے ہمت سے کام لیا۔ وہ اپنی شریک حیات کو لینے اپنی سسرال پہنچ گئے۔ لیکن سسرال والوں کی بے رخی اور پروین کے سامنے نہ آنے سے ان کا دل ٹوٹ گیا۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ پروین صرف دو منٹ ان سے بات کرلے۔ انہیں امید تھی کہ وہ اسے گھر لے جانے پر ضرور راضی کرلیں گے۔ لیکن پروین نے انہیں کوئی موقع نہیں دیا۔ اس بے عزتی سے وہ بالکل ٹوٹ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔ لڑکی والوں کی طرف سے جلد ہی طلاق کی مانگ ہوگئی۔ ابھی تو لوگوں کے بھونڈے مذاق اور عورتوں کی کھسر پھسر بھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ طلاق کا نام سن کر وہ سکتے میں رہ گئے۔ وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

انتظار بیگ نے کچھ تحفوں کے ساتھ اپنی بیوی کو ایک رقعہ لکھا اور اپنے دل کا حال بیان کیا۔ انہیں نے یقین دلایا کہ وہ شوہر ہونے کے تمام حقوق پورے کریں گے۔ وہ اس کی امیدوں پر پورے اتریں گے۔ وہ ہر ممکن اس کو خوش رکھنے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے منت کی کہ وہ ان کو ایک موقع اور دے اور یوں لوگوں کی نظروں میں تماشا بننے سے انہیں بچالے۔ شادی بیاہ اور طلاق کوئی گڈے گڑیوں کا کھیل نہیں یہ تو روحوں کا بندھن ہے۔ لیکن پروین پر اس سب کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ اس کے ماں باپ بھی بضد تھے کہ فیصلہ ہو جائے۔ زیادہ دن گذر گئے تو ہماری بیٹی کہیں کی نہیں رہے گی۔ انتظار کسی بھی قیمت پر طلاق

دینے کو راضی نہیں تھے۔ لیکن گھر والوں کے دباؤ نے انہیں طلاق دینے پر مجبور کر دیا۔ ادھر طلاق ہوئی ادھر دلہن کا جہیز رخصت ہوا۔ اس کے بعد گھر میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ عزیزوں اور یاروں دوستوں کا نشانہ بننے کے خوف سے انہوں نے خود کو گھر کی چہار دیواری میں بند کر لیا۔ بھانجے بھانجیوں اور بھتیجے بھتیجیوں سے وہ نظریں چرانے لگے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سب کی نگاہیں ان کے جسم کو ٹٹول رہی ہیں۔ اپنی مردانگی پر اتنی بڑی ضرب نے انہیں دیوانہ بنا دیا تھا۔ جس حسن پر وہ دل ہی دل میں فدا ہوئے تھے اس حسن میں کتنی زہریلی ناگن پوشیدہ تھی۔ کتنے آہستہ سے اس نے انتظار کو ڈس لیا تھا۔ انتظار کے لئے پروین وہ ناگن ثابت ہوئی کہ جس کا ڈسا پانی بھی نہ مانگ سکے۔ جیسے جیسے وقت گذرتا گیا انتظار کے زخم مندمل ہونے کے بجائے اور گہرے ہونے لگے۔ رہ رہ کر ایک سوال بار بار انہیں پریشان کرتا کہ کہیں اس کی تہہ میں کوئی دوسرا مرد تو نہیں؟؟

پروین کی سرد مہری انہیں بھلائے نہ بھولتی---ایک برس بھی نہیں بیت پایا تھا کہ یہ خبر بھی سن لی کہ پروین کی دوسری شادی ہو گئی۔ یہ سن کر تو انتظار کے دل کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ ان پر اتنا بڑا لانچھن لگا کر انہیں برباد کر کے وہ خود آباد ہو گئی۔ ان کی نامرادیوں اور رسوائیوں پر اس نے اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کیا تھا۔ انتظار کے اندر ایک عجیب سی دیوانگی پیدا ہوئی۔ کئی مرتبہ ان کی یہ دیوانگی حد سے گذرتی تو ان کے اندر ایک ایسی خواہش پیدا ہوتی جس سے وہ اپنا آپ ثابت کر سکیں۔ وہ سوچتے کہ کسی لڑکی کو پکڑ کر ریپ کریں اور پھر اخباروں میں ان کے ریپ کا قصہ چھپے۔ ہر آدمی اسے پڑھے تب دنیا کو معلوم ہو کہ وہ بھی ایک مرد ہیں مکمل مرد---

اسی دوران انتظار کے اسٹاف میں سوشل سائنس کی ایک نئی ٹیچر عروصہ کا

تقرر ہوا۔ اس کی نظر التفات نے انتظار کے اندر ایک حوصلہ پیدا کیا۔ جلد ہی وہ دونوں گہرے دوست بن گئے۔ پھر یہ دوستی ازدواجی زندگی میں تبدیل ہو گئی۔ خوشیاں انتظار کی منتظر تھیں۔ دن، ماہ اور سال بیتنے لگے۔ انتظار پیارے پیارے دو بچوں کے باپ بن گئے۔ ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا اور بچے ان کی زندگی۔ وقت ان کے زخموں کا مرہم بن گیا۔ لیکن ایک پھانس سی تھی جو انہیں اب بھی کہیں نہ کہیں چبھتی محسوس ہوتی تھی۔ آج سترہ برس بعد وہ اسی شہر میں اپنے دوست محمود کے بیٹے فراز کی برات میں آئے تھے۔ یوں اچانک ایک عورت میں پروین کی جھلک دیکھ کر ان پر بجلی سی گر پڑی۔ پھر انہوں نے سوچا شاید دھوکا ہوا ہو۔ کیونکہ وہ رنگ روپ وہ حسن و نزاکت جس پر انتظار فدا ہوئے تھے دور دور تک نہیں تھا۔ میک اپ کی موٹی تہہ نے اس کے چہرے کو اور بھی بد نما بنا دیا تھا۔ جسم بھی موٹا اور بھدا ہو چکا تھا۔ لیکن کمر پر لہراتی ناگن سی چوٹی نے انہیں یقین دلایا کہ یہ پروین ہی ہے۔ انتظار نے اپنے دوست محمود کو الگ لے جا کر چپکے سے پوچھا "وہ کون ہے؟"

محمود بڑے خوش ہو کر بولے -- "ارے یہ ہماری بہو کی خالہ ہیں --- ہماری سمدھن ہیں سمدھن" -- "بڑی خوش مزاج ہیں لیکن بے چاری بے اولاد ہیں۔"

انتظار یہ سن کر سن سے رہ گئے۔

ادھر دولہا کی سلامی چل رہی تھی۔ لڑکے لڑکیاں دولہا سے چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ کوئی دولہا کو مٹھائی کھلا رہا تھا، کوئی دودھ بھرا گلاس لئے کھڑا تھا، کسی نے دولہا کو نمک مرچ کا پان کھلا دیا تھا۔ لوگ قہقہے لگا رہے تھے، انتظار کو لگا دولہا کے پان کی مرچیں ان کے زخم پر پڑ گئی ہیں اور اس میں ٹیس سی اٹھنے لگی ہے۔ اور اس کے اندر کلبلاتی پھانس کچھ اور زیادہ چبھنے لگی ہے۔ جب اس کی چبھن برداشت سے باہر ہو گئی تو انہوں نے فیصلہ کیا آج اس پھانس کو نکال ہی دیا جائے۔

لوگ دولہا کی سلامی میں مصروف تھے انہوں نے موقع غنیمت جانا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر انتظار پروین تک پہنچ گئے۔ اور اس کے سامنے جاکر کھڑے ہو گئے۔ پروین نے نظریں چرالیں۔ اور رخ بدل لیا۔ انتظار پھر اس کے سامنے آئے۔ تھوڑا جھک کر بہت آہستہ سے انہوں نے پروین کے کان میں بس ایک جملہ کہا۔

"کیا وہ بھی میری طرح....."

☆☆☆

کنفیشن

کنفیشن

رقیہ کے صبر وضبط کی انتہا اس مقام پر ہو گی یہ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ بدلتی ہواؤں کا رخ تو وہ بہت پہلے سے بھانپ گئی تھی لیکن یہ ہوائیں اس کے وجود کو تنکے کی طرح اڑا دیں گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ امی کے منہ سے نکلے ہوئے پانچ الفاظ نے ماں کے تقدس کو پامال کر دیا تھا۔ اس کے ذہن میں آباد ماں کے قدموں تلے کی جنت دوزخ کی آگ سے تپنے لگی تھی۔ اس کی تپش میں وہ خود کو جلتا، جھلستا محسوس کر رہی تھی۔ کاش آج ابا زندہ ہوتے..... ابا کا دھیان آتے ہی اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو نکل کر اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے۔ دس برس پہلے کا وہ دن اسے آج بھی جوں کا توں ذہن نشیں تھا جب اس کے ابو کو اچانک خون بھری قے ہوئی تھی۔ آناً فاناً گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ اس کی امی نے دیوار میں کلائیاں مار مار کر اپنی تمام چوڑیاں توڑ دی تھیں۔ ان کی کلائیاں لہولہان ہو گئی تھیں۔

اس وقت وہ صرف آٹھ برس کی تھی۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ اچانک ابو کو کیا ہو گیا ہے۔ سب کو روتا ہوا دیکھ کر وہ بھی رونے لگی تھی۔ اس کے رونے سے اس کی چھوٹی دونوں بہنیں منی اور گڈی بھی رونے لگی تھیں۔ بہنوں کو روتا دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہو گئی اور انہیں چپ کرانے لگی۔ دونوں بہنوں کو اس نے اپنے ناتواں سینے سے لگا لیا۔ اسے محسوس ہوا وہ اچانک بڑی اور بہت بڑی ہو گئی ہے۔ تب اس کا بچپن چپکے سے نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ ہر وقت چھوٹی دونوں بہنوں کو اپنے ساتھ لگائے رکھتی۔ وقت نے جہاں اسے عمر سے پہلے سنجیدگی عطا کی تھی وہیں اسے وقت سے پہلے جوانی کے مرحلے بھی پیش آنے لگے۔ اب وہ کوئی بچی نہیں تھی اٹھارہ برس کی بالغ النظر رقیہ تھی اور یہی بالغ النظری رقیہ کے لئے سوہان روح بن گئی تھی۔ اس کا بس چلتا تو..... لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکی۔ وہ سب کچھ دیکھتی رہی اور سہتی رہی اور نظر انداز کرتی رہی۔ وہ کسی سے کیا کہتی--؟؟ کہ اس کے ابو کے بہت قریبی دوست دلاور خاں جنہیں ابو ہمیشہ بڑا بھائی اور وہ تایا کہتی تھی اس نے ابا کی ملکیت پر ناجائز قبضہ کر لیا ہے۔ اس میں اس کی امی بھی تو برابر کی شریک رہی تھیں۔ اتنا ہی نہیں اس کی پھوپی کے بیٹے مراد کا رشتہ جب امی نے نامنظور کیا تو اس کی کوئی معقول وجہ رقیہ کو نظر نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ وہ امی کی نند کا بیٹا تھا۔ مراد کو لڑکیوں کی کمی نہیں تھی وہ پڑھا لکھا وجیہہ اور برسر روزگار تھا۔ وہ تو اس کے مقابلے میں بہت معمولی تھی۔ اس نے تو دسویں کے بعد تعلیم بھی چھوڑ دی تھی۔ حالات ہی ایسے تھے۔ اس رشتے کی اصل وجہ تو پھوپی جان کی محبت تھی۔ وہ اپنے بھائی کی نشانی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھیں۔ پھوپی جان کی بہت منت سماجت کے بعد بھی امی نے اس رشتہ کو قبول نہیں کیا۔ اس دن کے بعد سے پھوپی جان اور مراد بھائی نے اس دہلیز پر قدم نہیں رکھا۔

امی کے بدلتے طور طریقے رقیہ کی آنکھوں سے چھپے نہیں رہے۔ امی اب سلائی

مشین کے بجائے اپنے اوپر زیادہ توجہ دیتی تھیں۔ رقیہ پر گھر کے تمام کام چھوڑ کر وہ دن دن بھر غائب رہتی تھیں۔ اور جب گھر واپس آتیں تو انتہائی خوش اور مطمئن نظر آتیں۔

ایک دن امی نے بہت خوش ہو کر اسے یہ خبر سنائی کہ وہ بہت خوش نصیب ہے۔ بڑی نصیبوں والی ہے کیونکہ اس کے تایا نے اپنے بیٹے اچھن کے لئے اسے مانگا ہے۔ اتنے بڑے گھر جائے گی تو تمام زندگی عیش کرے گی۔ گھر کے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ ہمیشہ سونے میں لدی پھندی رہے گی۔ نوکر چاکر کام کریں گے۔ عیش کرے گی ہماری رقیہ۔ امی نے بلائیں لیتے ہوئے اسے اپنے سینے سے چمٹالیا۔ پیار کرتے ہوئے انہوں نے رقیہ سے کہا "میں نے تو بس بغیر سوچے سمجھے فوراً ہاں کر دی۔"

'ہاں کر دی' رقیہ نے حیرانی سے پوچھا--

ہاں اور کیا--اتنے بڑے گھر کے رشتے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ ایسے رشتے کے لئے سوچا نہیں جاتا۔

"لیکن امی--مجھ سے پوچھے بغیر.....؟؟"

"تم تو ابھی بچی ہو-- تمہیں اونچ نیچ اور اچھے برے کی سمجھ ابھی کہاں ہے؟؟"

دلاور خاں کے نیم پاگل بیٹے سے اپنی نسبت طے ہونے پر رقیہ خون کے آنسو رونے لگی۔ وہ تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنی زندگی کے فیصلے اسے اس طرح سننے کو ملیں گے۔ امی کے آگے اس کی تمام جدوجہد بے سود ثابت ہوئی۔ اس دن سے زندگی کے تمام زہر کو بوند بوند تنہا وہ اپنے حلق سے اتارتی گئی۔ لیکن آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ مدت سے جس آدمی سے اندر ہی اندر نفرت کرتی تھی وہ اس کے سامنے اس روپ میں بے نقاب ہو گا ایسا وہ نہیں سوچ سکی تھی۔ رقیہ کو جھرجھری سی محسوس ہوئی اور وہ لرزنے لگی۔ اس نے خود کو چادر میں لپیٹ لیا۔ ہوا یہ تھا کہ امی صبح جیسے ہی گھر سے نکلیں دلاور خاں گھر میں داخل ہوا۔ رقیہ نے کہا

امی ابھی ابھی کہیں گئی ہیں دوپہر تک آئیں گی۔

"تم تو ہو میری جان" کہتے ہوئے دلاور خاں رقیہ کے قریب آنے لگا۔ رقیہ اس بات کے لئے بالکل تیار نہیں تھی۔

پیچھے ہٹو--رقیہ نے بڑی حقارت سے کہا--

رقیہ کے تیور دیکھتے ہوئے دلاور خاں نے بڑی نرمی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر ہلائی "ناراض کیوں ہوتی ہو؟"

رقیہ نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا--شرم نہیں آتی تم کو--؟؟

دلاور خاں نے رقیہ کی کلائی اپنی گرفت میں لی اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بس پھر کیا تھا رقیہ آپے سے باہر ہو گئی---ذلیل، کمینے، کتے، ایک طرف تو اپنے بیٹے سے میری شادی کی بات کرتا ہے دوسری طرف اپنا منہ کالا کرتا ہے بے شرم، پہلے امی سے اور اب.....

اس کی بات مت کر وہ تو چچوڑی ہوئی ہڈی ہے--اپنی بات کر--میری بات مانے گی تو ملکہ بن کر رہے گی--

تھوکتی ہوں تجھ پر بے غیرت--آخ تھو--اور رقیہ نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ دلاور خاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے رقیہ کی کلائی پکڑ کر ایسی مروڑی کہ رقیہ کی جان نکل گئی۔ رقیہ ڈھیلی پڑی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے رقیہ کا کرتا گلے سے پکڑ کر ایسا پھاڑا کہ کرتے کا اگلا حصہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ رقیہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو چھپاتی ہوئی باہر کو بھاگی کہ دلاور خاں پیچھے سے اس پر جھپٹ پڑا۔ اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ کر اس نے پوری طرح رقیہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور پھر بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر برسوں سے قطرہ

قطرہ زہر پینے والی رقیہ ایک ناگن بن گئی اس نے پوری قوت سے دلاور خاں کے بازو میں اپنے دانت پیوست کر دیئے۔ دلاور خاں بلبلا گیا۔ ڈھلتی جوانی کا تناؤ ڈھیلا پڑا تو رقیہ اس کے چنگل سے نکل بھاگی۔ اس نے سل کا پتھر اٹھالیا سر پھوڑ دوں گی تیرا--- مار ڈالوں گی تجھے---دفع ہو جا یہاں سے اپنی منحوس صورت لے کر۔

نمک حرام---اس کا بدلہ تجھ کو مل جائے گا بہت پچھائے گی تو--- یہ کہتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا۔ رقیہ کی حقارت بھری نظریں دروازے تک اس کا پیچھا کرتی رہیں۔ پھر وہ دیر تک بستر پر بے ترتیب پڑی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ سسکتی رہی۔ پھر اٹھی نہادھو کر اس نے اپنا حال درست کیا۔ اس نے سوچا وہ امی کو کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ امی کے گناہ کو بے نقاب کر کے اس طرح شرمندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا وہ آج سے اپنی لڑائی خود لڑے گی۔ وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ منی اور گڈی اسکول سے آگئیں۔ وہ اسکول کے فنکشن کی روداد مزے لے لے کر سنانے لگیں۔ لیکن رقیہ کو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے تو دلاور خاں اپنا پھٹا ہوا کرتا، اپنا نیم عریاں جسم اور اس کے بازو میں گڑے دانت اس کے دماغ کا ہالہ کئے ہوئے تھے۔ بے خیالی میں اس نے اپنے دانتوں کو بھینچا تو منی گڈی حیران ہو گئیں وہ باتیں کرتے کرتے رک گئیں۔ کیا ہوا آپا؟ گڈی نے پوچھا--- منی نے آپا کو پکڑ کر ہلایا کیا ہو گیا آپا---رقیہ چونکی---کچھ نہیں---کچھ نہیں---ایک ڈراونا خواب دیکھ لیا تھا۔

جاگتے میں۔ منی نے معصومیت سے پوچھا---

ہاں---تم سناؤ---اور کیا ہوا آج اسکول میں؟ سب کچھ تو سنا دیا---کھانا دیجئے۔ بھوک لگی ہے۔ دونوں بہنوں کو کھانا کھلا کر، رقیہ ان کے ساتھ لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد امی آگئیں۔ خلاف توقع امی نے لیٹی ہوئی رقیہ کے جسم سے چادر کھینچ کر ایک طرف پھینک دی---بال پکڑ پکڑ کر اس کی گردن کو کئی جھٹکے دیئے، کئی تھپڑ رسید

کیئے پھر بھی تسلی نہیں ہوئی تو پاؤں سے چپل نکال کر دھڑادھڑ اسکی پیٹھ پر چپل ہی چپل بجادیئے۔ وہ غصہ سے پاگل ہوئی جارہی تھیں۔ امی سنئے تو۔ امی سنئے تو..... میں نے کچھ نہیں کیا امی---- آپ سنئے تو---- امی میری بات تو سنئے---- رقیہ کے رونے اور گڑگڑانے کا ان پر رتی بھر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ چیخے جارہی تھیں کمینی، رنڈی، چھنال، نمک حرام جس تھالی میں کھاتی ہے اسی میں چھید کرتی ہے۔

یہ کیا کہہ رہی ہو امی؟؟

تجھے پتہ ہے چڑیل میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تو سب جانتی ہے۔ بدذات ہے تو۔

میں پوچھتی ہوں "حرام زادی تیرا کیا گھِس جاتا".....؟؟

امی---- رقیہ چیخی--- تو کیا---- رقیہ کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ امی پھر چلائیں تمہیں سب کو زہر دے کر سلادوں گی۔ منی اور گڈی سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں وہ بھی رونے لگی تھیں۔ گھر میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ امی نے چپل زمین پر پٹخی پاؤں میں ڈالی اور بڑبڑاتی ہوئی پھر گھر سے باہر نکل گئیں۔ رقیہ کی نظروں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ اس کے آنسو خشک ہوگئے۔ اس نے سسکنا بند کردیا۔ اپنی آسودگی کی خاطر امی اسے بھی داؤ پر لگادیں گی اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ کاش آج ابا زندہ ہوتے..... وہ پھر سِسک سِسک کر رو پڑی---- اسے لگا ابا اس کو تسلی دے رہے ہیں اس کی ہمت بندھا رہے ہیں۔ اس نے اپنے فیصلے پر پھر غور کیا۔ وہ خود کو حالات کے دھارے پر نہیں چھوڑے گی۔ وہ گھر چھوڑ کر بھی نہیں جائے گی۔ رات گئے امی واپس آئیں تو کسی نے بھی ایک دوسرے کو کھانے کے لئے نہیں پوچھا-- دونوں دم سادھے اپنے اپنے بستروں میں لیٹی رہیں۔ رقیہ تو پُر سکون تھی لیکن امی کے اندر ایک جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ رات آنکھوں آنکھوں میں گذر گئی--- جانے کس وقت رقیہ کو جھپکی آگئی جب آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا امی گھر پر

نہیں ہیں۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے ڈر کے مارے منی اور گڈی کو اسکول جانے سے روک لیا۔ وہ خود کو آنے والے خطرے کے لئے تیار کرنے لگی۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ دوپہر کو جب امی گھر میں داخل ہوئیں تو سب کی نظریں ایک ساتھ امی کی طرف اٹھ گئیں۔ امی نے باری باری سے سب کے چہروں کو دیکھا پھر ایک دم چلاتی ہوئی بولیں کیا ہو گیا ہے تم سب کو؟ ارے کم بختوں کوئی مر گیا ہے کیا؟ اس سے پہلے کہ رقیہ کچھ کہتی امی نے فیصلہ سنایا---اس رقیہ کی بچی کی شادی طے کر دی ہے میں نے------ سب ساکت و جامد ایسے ہی بیٹھے رہ گئے۔ رقیہ نے پھر لب کھولے، امی اس مرتبہ بھی اس سے پہلے بول پڑیں---- مراد سے ـــــ مراد کا نام آتے ہی منی اور گڈی کھلکھلا پڑیں۔ مراد بھائی سے---- وہ تو بہت اچھے ہیں---- ہیں نہ آپا------ رقیہ کا منہ حیرانی سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ منی اور گڈی خوشی کے مارے اپنی آپا سے لپٹ گئیں اور پل بھر میں ہی تینوں امی کے گلے کا ہار بن گئیں۔ امی نے تینوں کو الگ کرتے ہوئے کہا لیکن ایک شرط ہے..... رقیہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو---- کاٹو تو بدن میں لہو نہ ہو----وہ ہونقوں کی طرح امی کی شرط کا انتظار کرنے لگی.....

"تمہیں آج اور اسی وقت میری دونوں سلائی مشینوں کی صفائی کرنا ہو گی۔"

امی----- میزی امی------- کہتے ہوئے رقیہ ماں کے سینے سے لپٹ گئی۔ دونوں کی آنکھوں سے گنگا جمنا بہہ رہی تھی۔

☆☆☆

زاہدہ مقدس

زاہدہ مقدس

زاہدہ آپا کا پورا نام زاہدہ مقدس تھا۔ صرف نام سے ہی نہیں حقیقت میں بھی وہ زاہدہ مقدس ہی تھیں۔ بڑی پاک صاف، نفاست پسند، پرہیز گار، نیک، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بڑی خوددار اور جی دار، صبر و تحمل میں ان کا جواب نہیں۔ خوش شکل اور خوش مزاج۔ کائنات کی تمام شوخیاں ہمیشہ ان کے چہرے پر رقصاں رہتیں۔ خاندانی رعب اور دبدبہ چھوٹی سی عمر سے ہی ان کی پیشانی سے جھلکنے لگا تھا۔ آنکھوں کی بے پناہ چمک میں ذہانت کے ذخیرے پنہاں تھے۔ زبان میں لکھنؤ کی نزاکت اور چاشنی اس قدر گھلی ہوئی تھی کہ ہر کوئی ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ اسکول اور پھر کالج کے زمانے میں ہر دل کی دھڑکن ان کے نام سے وابستہ ہوتی۔ ادھر زاہدہ آپا نے بی اے کیا ادھر ماں باپ نے بیاہ۔ گھر میں تین بھائیوں سے چھوٹی اور ایک بہن سے بڑی تھیں۔ بیاہ کر سسرال گئیں اور جلد ہی ایک بیٹے کی ماں بن گئیں۔ جس کا نام انہوں نے عالم

رکھا۔ واقعی وہ ان کے لئے کسی کائنات سے کم نہ تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں زاہدہ آپا اپنے شوہر کے دل کی دھڑکن نہ بن سکیں۔ خودداری جب انا بن جائے تو کائنات ایک طرف اور انا ایک طرف۔ لہذا بات بات پر دونوں کی خودداری انا بن کر ٹکرائی اور دوریاں بڑھ گئیں۔ عالم نے پل صراط کا کام کیا۔ اب خدا جانے زاہدہ آپا دوزخ سے نکل کر جنت میں آئیں یا جنت سے نکل کر دوزخ میں۔ کبھی ماں باپ اور بھائی بھاوجوں پر بوجھ نہیں بنیں۔ انہوں نے خاموشی سے عالم کے ساتھ ایک نئی دنیا آباد کرلی۔ یہ خاردار راستہ انہوں نے خود چنا تھا۔ زاہدہ آپا نے اپنے اصولوں کے ساتھ ٹوٹنا تو سیکھا تھا جھکنا نہیں۔ انہوں نے بہت خوبصورتی سے سادگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ وہ دل و جان سے اپنے بیٹے عالم کی پرورش میں لگ گئیں۔ زاہدہ آپا نے عالم کے جائز اخراجات کا مطالبہ بھی کبھی شوہر سے نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے شوہر کا رونا بھی کبھی کسی سے نہیں رویا۔ دونوں ماں بیٹے اپنی دنیا میں بڑے مطمئن اور خوش و خرم تھے۔

زاہدہ آپا اب بھی پہلے کی طرح مسکراتی تھیں۔ سب سے ملتی جلتی تھیں۔ ان کی سوشل لائف میں رتی بھر بھی فرق نہیں آیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ انہوں نے بہت عیش و آرام میں اپنے بیٹے عالم کو پالا اور کانونٹ میں پڑھایا۔ خود بھی بی ایڈ کر کے انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کی لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس سب کے لئے انہوں نے کیا کیا؟ یہ تو بس ان کا بیٹا عالم جانتا تھا یا وہ خود یا پھر ان کا خدا۔ اس مشقت کی گواہ ان کی بند مٹھیاں تھیں جنہیں کسی کے سامنے انہوں نے کبھی نہیں کھولا۔

کڑی آزمائش سے گزرنے کے بعد آخر ایک سرکاری پرائمری اسکول میں انہیں ملازمت مل ہی گئی۔ دن، ماہ اور سال تیزی سے بیتنے لگے۔ ننھا منا عالم پروان چڑھ کر ماشاء اللہ کیسا خوبصورت چھتنار کا درخت بن گیا تھا۔ اب وہ ہر کام میں ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ زاہدہ آپا

آپا کی محنت رنگ لائی۔ ان کی زندگی میں وہ دن بھی آیا جب عالم انجینئر بن کر امریکہ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ زاہدہ آپا کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہ ہو کہ ان کا بیٹا اتنی ترقی کرے گا۔ لیکن نہیں ——— شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ زاہدہ آپا کی قوت ارادی اور عزم محکم نے ہی انہیں یہ دن دکھایا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے آسمان کے تارے چھونے کی تمنا رکھتی تھیں۔ انہوں نے بڑی خوشدلی سے اپنے سینے پر پتھر رکھ کر عالم کو رخصت کر دیا۔

دو سال میں ایک مرتبہ وہ آندھی اور طوفان کی طرح ماں سے ملنے آتا اور چلا جاتا۔ اب زاہدہ آپا عالم کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ بیٹا لاکھ امریکہ میں بس جائے لیکن بہو تو ہندستانی ہی ہونی چاہیئے۔

لڑکیاں دیکھتے دیکھتے کئی برس گذر گئے۔ عالم کے جوڑ کی لڑکی ان کی نظر سے ابھی تک نہیں گزری تھی۔ کچھ نہ کچھ خامی انہیں ہر لڑکی میں نظر آجاتی تھی۔ کئی برس کی تلاش کے بعد آخر انہوں نے زمرد کو ڈھونڈ ہی لیا۔ لڑکی کیا تھی کسی پرستان کی شہزادی تھی۔ قدرتی صناعی کا ایک حسین پیکر۔ جسے دیکھو تو بس دیکھتے ہی رہو۔ بڑے زور شور سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ حیدر آباد، لکھنو، بنارس اور نہ جانے کن کن شہروں سے دلہن کے لئے قیمتی زیورات اور پوشاکیں تیار کرائی گئیں۔ نایاب گوہر سے جڑے ہوئے قیمتی تاج بیٹا اور بہو کے لئے بنوائے گئے۔ عالم تو بس ماں کی ہر خواہش کے آگے سر بہ سجود ہو جاتا تھا۔ الغرض شادی کے دعوت نامے سے لے کر ولیمے کے کھانے تک ہر چیز ایسی تھی کہ ہر آدمی عش عش کر رہا تھا۔ شادی کیا تھی کسی طلسماتی داستان کا منظر تھی۔ زاہدہ آپا نے دل کھول کر اپنے ارمان پورے کئے تھے۔ مدتوں بعد ان کے آنگن میں چاند سورج اترے تھے۔ وہ اپنے چاند سے بیٹے اور بہو پر واری صدقہ جاتی تھیں۔

دو ماہ کیسے پلک جھپکتے بیت گئے۔ عالم پھر سے اڑ گیا اور ساس بہو اکیلی رہ گئیں۔ راجستھان، شملہ، اوٹی، مسوری، نینی تال، جتنا ہو سکتا تھا زاہدہ آپا نے بہو کو گھمایا۔ وہ عالم کو فون پر فون کرتیں، خط پر خط لکھتیں، بہو کو جلد سے جلد بلانے کا انتظام کرو۔ اس کا کمہلایا ہوا چہرہ ان سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ عالم بھی اس کے بغیر کانٹوں پر سو رہا تھا۔ عالم کے پاس فلیٹ قیمتی ساز و سامان نوکر چاکر سب کچھ تھا وہ تو صرف ماں کی وجہ سے زمرد کو چھوڑ آیا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی تھی کہ اس کی ماں ملازمت چھوڑ کر اس کے پاس رہیں لیکن وہ تیار نہیں ہوئیں۔

بیٹے کی ضد کے آگے آخر کار زاہدہ آپا نے ہتھیار ڈال دیئے۔ انہوں نے نوکری تو نہیں چھوڑی ہاں ایک برس کی چھٹی لے کر بہو کے ساتھ انگلینڈ جانے پر راضی ہوگئیں۔ اس ایک برس کی یادوں کو سمیٹ کر جب زاہدہ آپا ہندوستان لوٹیں تو بیٹا اور بہو کے گن گاتے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ اس ایک برس کی خوشیوں اور یادوں کو وہ کئی برس تک اپنے عزیزوں اور دوستوں میں بانٹتی رہیں۔

ایک دن اچانک حرکت قلب کے جھٹکے نے انہیں اسپتال پہنچادیا۔ عالم راتوں رات اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ گیا۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ اس مرتبہ اس نے ماں کی ایک نہ سنی۔ زبردستی ملازمت سے استعفی دلوا کر وہ انہیں اپنے ہمراہ لے گیا۔

اسے خدشہ تھا کہ ملازمت ہو گی تو اس کی ماں واپس آکر پھر کسی حادثہ سے دوچار ہو سکتی ہیں۔ اسے یہ کسی بھی قیمت پر منظور نہیں تھا۔ زاہدہ آپا ماں، بھائی، بھاوجیں بھتیجے، بھتیجیاں، اسٹاف اور سینکڑوں شاگردوں کو چھوڑ کر بیٹے کے ساتھ چلی گئیں۔ ان کے ملنے والوں اور دوستوں عزیزوں میں برابر ان کے خط آتے رہتے تھے کہ انہیں ہر عیش ہے ہر آرام ہے لیکن وہ اپنے ہندوستان، یہاں کے کلچر اور یہاں کے لوگوں کو بھول نہیں سکیں۔ اس سب کی یاد انہیں بہت تڑپاتی ہے۔

زاہدہ آپا کو ہندوستان، اس کی روایات ،اس کے کلچر سے جتنا پیار تھا زمرد اس سے بالکل پلٹ نکلی۔ اس نے مغربی رنگ میں خود کو ڈبو دیا۔ اب اسے ساس کی موجودگی گراں گزرنے لگی۔ زمرد کی مصروفیتیں گھر کے بجائے باہر بڑھنے لگیں۔ اپنے ننھے منے بیٹے کو ساس اور نوکروں پر چھوڑ کر وہ زیادہ تر گھر سے باہر رہتی۔ نہ اسے زاہدہ آپا کی دوا کا خیال رہتا نہ بیٹے کی پرورش کا۔ یہ سب باتیں تو زاہدہ آپا یہ سوچ کر سہہ لیتی تھیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ زمرد اپنی ذمہ داری سمجھنے لگے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ زمرد کے لباس کی عریانیت نے زاہدہ آپا کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ نتیجہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر آئے دن ساس بہو میں جھگڑا ہونے لگا۔ زمرد ہر بات میں میاں کے کان بھرتی۔ اور زاہدہ آپا ہر بات یہ سوچ کر پی لیتیں کہ وہ اپنے بیٹے کا سکون درہم برہم کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ عالم ان سے انتہائی بے پرواہ ہو گیا ہے۔ بہو نے تو پہلے ہی بولنا بند کر دیا تھا اب بیٹا بھی کنی کاٹنے لگا۔ ماں بیٹے کی قربتیں محدود ہو کر صرف تین جملوں میں سمٹ آئی تھیں۔ امی دوا کھائی، کھانا کھایا، کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجئے گا۔ اور بس۔ ہاں آفس جاتے وقت خدا حافظ کرنا وہ ابھی نہیں بھولا تھا۔ کافی دنوں سے کھانا ناشتہ بھی وہ اپنے کمرے میں ہی کر لیتا تھا۔ اس لئے بات کا ہر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اکیلے پڑے پڑے زاہدہ آپا کا دل گھبرانے لگتا۔ پوتے سے بھی کتنی باتیں کرتیں۔ پانچ برس کا ننھا ساحل دادی کے دل کی حالت بھلا کیا سمجھتا۔ انہیں پچھلے تمام دن یاد آنے لگتے۔

اس دن بھی وہ انہیں خیالات میں گم تھیں انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا دن چڑھ گیا ہے۔ گیارہ بج گئے ہیں۔ کیا بات ہے آج عالم آفس جاتے وقت ملنے نہیں آیا۔ آج عالم آفس نہیں گیا کیا؟ کیا بات ہے کہیں اس کی طبیعت خراب تو نہیں؟ یہ خیال آتے ہی وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ بہو کے کمرے میں گئیں۔ بہو کچھ

سہیلیوں اور دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ ساس کو دیکھ کر اس کی بھنویں تن گئیں۔ زاہدہ آپا نے بہت نرمی سے پوچھا "بہو —— عالم کہاں ہے؟ "آفس اور کہاں —— کیا ساری عمر آپ کے کولہے سے لگے بیٹھے رہیں گے۔"

سب نے زوردار قہقہہ لگایا اور زاہدہ آپا شرمندہ سی ہو کر اپنے کمرے میں واپس آ گئیں۔ سارا دن وہ ذہنی تناؤ میں مبتلا رہیں۔۔۔ ان کی روحانی گھٹن نے انہیں اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ ان کا دل چاہتا تھا کوئی ان کے پاس بیٹھے ان سے باتیں کرے ان کا حال پوچھے اور سنے۔ وہ اپنوں کے پاس آ کر اپنوں سے کتنا دور ہو گئی تھیں۔

کئی دنوں سے ان کی طبیعت بہت مضمحل تھی۔ میگزین اور رسائل پڑھتے پڑھتے آنکھیں تھک جاتی تھیں۔ ایک سی زندگی جیتے جیتے وہ اوب گئی تھیں۔ کبھی کبھی باہر ٹہلنے چلی جاتی تھیں ساحل کے ساتھ گھوم پھر لیتی تھیں تو ذرا طبیعت بہل جاتی تھی لیکن اب ہر روز کوئی نہ کوئی بات گھر میں ایسی ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے ہی کمرے میں پڑی رہتیں۔ آج وہ سوچ رہی تھیں کہ عالم آئے گا تو وہ ضرور اس سے دوٹوک باتیں کریں گی۔ عالم کی سرد مہری اور بہو سے بار بار بے عزت ہونے کی وجہ وہ ضرور پوچھیں گی۔ عالم کافی دیر سے گھر آیا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ آرام کے لئے لیٹا ہی تھا کہ ماں کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

آیئے امی ——

طبیعت تو ٹھیک ہے نہ آپ کی؟

کھانا کھایا آپ نے؟

ڈاکٹر کے پاس کب جانا ہے آپ کو؟ تاریخ یاد رکھئے گا۔ ماں تو کچھ کہہ ہی نہیں پائیں اور عالم بولتا چلا گیا۔ اسی وقت زمرد کمرے میں داخل ہوئی اور تڑخ کر بولی "ان سے کہہ دیجئے۔ کم از کم میرے کمرے میں بغیر اطلاع کے نہ آیا کریں۔"

کیا کہہ رہی ہو بہو؟ مجھے تمہارے کمرے میں آنے کے لئے اطلاع کرنا پڑے گی۔

"ہاں اور کیا—— کوئی بھی بیٹھا ہو آپ آکر سب کے سامنے بے عزتی کر دیتی ہیں۔"

میں اور تمہاری بے عزتی—— یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ زاہدہ آپا زمرد کا منہ تکتی رہ گئیں۔ ان کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"وہی کہہ رہی ہوں جو آپ کرتی ہیں۔ کیا ضرورت تھی دوپہر کو میرے کمرے میں آنے کی۔"

"میں تو عالم کو پوچھنے چلی آئی تھی بہو——"

بس بس عالم کو پوچھنے کا تو بہانا تھا۔ دراصل آپ ہر وقت میری ٹوہ میں لگی رہتی ہیں۔ بہت ہو گیا۔ بس اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا۔

"عالم—— یہ زمرد کیا کہہ رہی ہے بولتا کیوں نہیں؟

کیا بولوں؟ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ عاجز آگیا ہوں روز روز کی چخ چخ سے۔ کیا کہوں میں؟ کیا آپ یہی چاہتی ہیں کہ یہ بھی آپ کی طرح گھر چھوڑ دے۔ اور راتوں کو جاگ جاگ کر قینچیاں گھسے۔ اور اپنے بیٹے کو پالے۔"

عالم—— یہ کیا بک رہا ہے؟؟

زاہدہ آپا کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ انگلیوں کے پوروں اور ہتھیلیوں پر پڑی ہوئی ٹھیٹوں کی چبھن پھر سے ہونے لگی۔

تجھے کیا ہو گیا ہے عالم—— تو نے تو سر عام مجھے ننگا کر دیا ہے..... اپنی ماں کو ننگا کر دیا ہے..... تو نے میری مشقت پر پانی پھیر دیا ہے..... تو بھول گیا ہے کہ میں نے تجھے——"

چلایئے مت ماں—— پلیز—— میں ہاتھ جوڑتا ہوں—— میری سمجھ میں

نہیں آتا آپ کو پریشانی کیا ہے.....؟ آپ کو کس بات کی کمی ہے.....؟؟

"کیا آپ کی زبان بند نہیں رہ سکتی۔"؟؟

"رہ سکتی ہے بیٹا ضرور رہ سکتی ہے۔"

زاہدہ آپا یہ کہہ کر تقریباً ہانپتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئیں اور قینچی اٹھا کر اپنی زبان کاٹ دی۔ خون کے فوارے ان کی زبان سے بہہ نکلے اور وہ وہیں گر کر بیہوش ہو گئیں۔

☆☆☆

جشن

جشن

اس شہر میں فساد کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فساد کی نوعیت بھی کوئی نئی نہیں تھی۔ یہاں تو فساد ایسے پیدا ہوتا تھا جیسے ماں کی کوکھ سے بچہ۔ ہمیشہ کی طرح یہ فساد بھی دو فرقوں کے درمیان تھا۔ اور حسب معمول وردی والے ایک فرقے کے ساتھ تھے۔

اس فساد میں ٹارگیٹ عبادت گاہوں کے ساتھ ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ عورت اس فرقے کی ایسی دکھتی رگ تھی کہ اس نے اچھے اچھوں کی کمر توڑ دی تھی۔ اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے کرتے ہزاروں بھالوں کی نوک سے چھد گئے تھے۔ زنا بالجبر تو معمولی بات تھی عورتوں کو مادرزاد ننگا کر کے ان کے ساتھ چوراسی آسنوں کا کھیل کھیلا گیا اور بلو فلمیں بنائی گئیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ہر گھناؤنے طریقے سے انہیں زدوکوب کیا گیا۔ باپ بھائیوں اور شوہروں کو زندہ رہ کر یہ تماشا دیکھنا پڑا۔ نہ دیکھنے کی صورت میں ان کے جسموں سے ان کی پہچان مٹا دی گئی۔ خوف و حراس نے چاروں

طرف اپنا ڈیرہ جمالیا تھا۔ شریف زادیاں تو ایک طرف اس شہر کی رنڈیاں تک خوفزدہ ہو گئی تھیں۔ کیونکہ یہ بھی زیادہ تر ایک ہی فرقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور ان سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر دوسرے فرقے کے تھے۔ ذرا سی دیر کو کرفیو کھلتا اور لوگ محفوظ مقامات پر پہنچنے کی کوشش کرتے۔ رنڈیاں بھی راتوں رات غائب ہو گئی تھیں۔

گوہر جان رات کے سناٹے میں بھیس بدل کر جب یہاں سے بھاگ رہی تھی تو جگو نے اسے دیکھ لیا تھا۔ جگو نے حیران ہو کر پوچھا۔ گوہر جان ----- آپ ----- ایسے میں ----- کہاں جا رہی ہو؟ اتنا پوچھنا تھا کہ گوہر جان گھبرا گئی ----- چپ ----- کوئی سن لے گا ----- چپ رہ جگو ----- سب چلے گئے یہاں سے ----- میں ہی اکیلی رہ گئی ہوں ----- کسی سے کہنا مت۔ یہ لے ----- تو تو میرے بھائی جیسا ہے نا ----- لے یہ ہار ----- سچے موتیوں کا ہے۔ تو لے لے۔ بڑا قیمتی ہے یہ ----- اپنی پتنی کو میری طرف سے دے دینا۔ گوہر جان نے گلے سے ہار اتار کر جگو کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ لیکن آپ واپس کب آئیں گی ----؟؟

"جب اوپر والا لائے گا جگو"۔

اور جگو اندھیرے میں گوہر جان کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سچے موتیوں کا قیمتی ہار پا کر جگو ایسا خوش ہوا کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔

رنڈیوں کا یہ چوک پچھلے سو برس سے آباد تھا۔ لیکن اس زمانے میں اور اس زمانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کے کیا ہاؤ بھاؤ ہوتے تھے۔ کیا سنگھار ہوتے تھے۔ بس دیکھ کر آنکھیں چکا چوند ہوتی تھیں۔

زمینداروں اور نوابوں کا دور دورہ تھا۔ چاند بائی، ستارہ بائی، پتلی بائی، شاردا بائی، نرگس بائی کی ہر طرف دھوم تھی۔ لوگ دور دور سے داد عیش حاصل کرنے آتے تھے۔ زمانہ بدلا حالات بدلے تو داد عیش کے طور طریقے بھی بدل گئے۔ رنڈیاں تو یہاں اب بھی آباد تھیں لیکن اب وہ بات کہاں۔ آدھی سے زیادہ تو ٹکھیائی تھیں جو ہر وقت پکے بیروں کی طرح دروازوں، کھڑکیوں اور چھجوں پر

جھولتی رہتی تھیں۔ کئی نے کال گرل کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اونچے پیمانے کی خاندانی تو بس گنتی کی تھیں۔ ان کے انداز بھی وہی خاندانی تھے۔ گوہر جان حسن میں لاجواب تھی۔ شباب کی کرنیں اس کی جوانی سے پھوٹی پڑتی تھیں۔ کسی نوابی خاندان کا نطفہ تھی۔ چھمی بائی اس سے بھی زیادہ خوبصورت تھی۔ سنتے تھے کہ نظام آباد کے صوبے دار پٹھان دلاور خاں کا نطفہ ہے۔ حسن کے دیوانے منہ مانگی دولت دینے کو تیار تھے۔ لیکن دونوں ہی منہ مانگی دولت کے بجائے نکاح کے دوبول کی طلبگار تھیں۔ اور اس کے لئے کوئی شیر دل ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔

مجرے کا رواج اب ختم ہو گیا تھا۔ بس کبھی کبھار کسی خاص فرمائش پر ہی مجرا ہوتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر ہوٹلوں وغیرہ میں گانے کے لئے جاتی تھیں۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ سے ان کو بھی جوجھنا پڑتا تھا۔ ان سب میں ایکا بہت تھا۔ لہذا اچھا برا وقت سب مل کر کاٹ لیتی تھیں۔ جب روٹی روزی کے دروازے بند ہو جائیں۔ اور عزت بچانے کے بھی لالے پڑ جائیں تو بھاگنا لازمی تھا۔

فساد کی رات کو گلفام ہوٹل میں چھمی بائی کی محفل سجی تھی۔ ساز و آواز دھیمے دھیمے سروں میں ماحول کو خوشگوار بنائے ہوئے تھے۔ ایک ہلکا سا نشا تھا جو ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ ایسے میں اچانک بھگدڑ مچی اور جنگل کے آگ کی طرح فساد پورے شہر میں پھیل گیا۔ چھمی بائی ہوٹل سے تو بحفاظت نکل گئی لیکن راستہ میں دھر لی گئی۔ وہ بہت روئی بہت گڑگڑائی بہت منت سماجت کی کہ ہم رنڈیوں کا کوئی مذہب نہیں۔ کوئی فرقہ نہیں۔ ہمارا مذہب تو ہمارا پیشہ ہے۔ ہم سب کے لئے برابر ہیں۔ لیکن ظالموں نے چھمی بائی کی ایک نہ سنی۔ چھمی بائی کے سازندے چھمی کو بچاتے بچاتے جاں بحق ہو گئے۔

صبح کے پانچ بجے چھمی بائی جس حالت میں کوٹھے پر پہنچتی اس کی شناخت کرنا مشکل تھی۔ لباس تار تار ہو چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا اس کے جسم کے ایک ایک حصہ کو

گدھوں نے نوچ ڈالا ہے۔

پل بھر میں ہی پورے چوک میں بھگدڑ مچ گئی۔ رنڈیوں کے تمام خاندان جھمی بائی کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اور بین کر کر کے رونے لگے۔ جھمی بائی کی سانس ابھی باقی تھی۔ لوگ ڈاکٹر کو لینے بھاگے ——— اتنے میں شور مچ گیا پولس آگئی پولس آگئی ——— پولس کا نام سنتے ہی جھمی کے بے جان جسم میں حرکت ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ چاروں طرف دیکھا۔ کپکپاتی ہوئی شہادت کی انگلی وردی والے کی طرف اٹھی ——— اسی وقت اس کی روح پرواز کر گئی ———

ایسا ہولناک منظر اس سے پہلے ان رنڈیوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا چوری چھپے اپنی عزت بچا بچا کر بھاگنے لگیں۔ پورے چوک میں موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ دوسرے شہروں میں بھی تشدد کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ عبادت گاہیں شہید ہوتی رہیں۔ ان سے تعلق رکھنے والے بھی شہید ہوتے رہے۔ جہاں بغاوت نے سر ابھارا فوراً کچل دیا گیا۔ اس فساد کا خاتمہ ہی جب ہوا جب ظلم و ستم کرنے والے تھک گئے۔

آہستہ آہستہ حالات معمول پر آنے لگے۔ کوٹھے بھی دھیرے دھیرے آباد ہونے لگے۔ پھر وہی شب و روز کی محفلیں سجنی شروع ہو گئیں۔ پوری رنڈی برادری نے اپنی واپسی کا جشن بہت دھوم دھام سے منانے کا پروگرام بنایا۔ ہفتوں پہلے تیاریاں شروع ہوئیں۔ کوٹھوں کو دلہن کی طرح آراستہ کیا گیا۔ ٹکھیائیوں نے بھی اپنے چھوٹے چھوٹے کمرے برقی قمقموں سے سجائے۔ اسپیشل شراب کا انتظام کیا گیا۔ ہر کام گوہر جان نے اپنی نگرانی میں کرایا۔ اس چوک کی رونق اس دن دیکھتے ہی بن پڑتی تھی۔ جگو پچاسوں پھولوں کے ٹوکرے اس سجاوٹ میں لگا چکا تھا۔ تمام رات جشن چلتا رہا۔ گھنگرو بجتے رہے۔ فضا میں رس گھولتے رہے۔ شراب کے جام پر

جام لڑھکتے رہے۔ڈھولک کی تھاپ اپنے عروج پر پہنچتی رہی۔شراب اور شباب نے چاروں طرف مستی لٹا رکھی تھی۔ ٹکھیائیاں اپنے اپنے کمروں میں داد عیش بکھیر رہی تھیں۔رنڈیوں کی یہ شاندار واپسی ایک تاریخی واقعہ بن گئی۔نہ جانے کس وقت ساز خاموش ہوئے کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔

جگو کی آنکھ کھلی تو سورج چڑھ چکا تھا۔دھوپ اس کے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ گوہر جان کو سورج نکلنے سے پہلے تازہ پھول دیتے دیتے اس کی آدھی عمر بیت گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اٹھا اور تازہ پھول لے کر گوہر جان کے کوٹھے کی طرف چل دیا—— رات کی رونق کا منظر اب بھی اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر یکایک وہ کسی چیز سے ٹکرایا پھول اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑے۔اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ آنکھیں کھولیں تو کھلی کی کھلی رہ گئیں— یہ کیا—— سیٹھ بھگوان داس—— لاش—— ایک نہیں کئی لاشیں—— یہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ سب کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں منظر بدل چکا تھا۔وہ چیخا اور الٹے قدموں بھاگا—— اور پھر چیختے چیختے اس کی آواز گلے میں گھٹ کر بند ہو گئی——"

ایک مرتبہ پھر بھگدڑ مچی—— تمام رنڈیوں کے کمروں سے لاشیں بر آمد ہوئیں۔ سب کی موت زہریلی شراب پینے سے ہوئی تھی۔ نچلا دھڑ سب کا ننگا تھا۔ اور ان کے جسم کے نازک حصے کٹے ہوئے تھے۔ان میں کئی لاشیں وردی والوں کی بھی تھیں اور رنڈی خانے کی تمام رنڈیاں غائب تھیں۔

☆☆☆

تکمیل

تکمیل

نکہت نے بھرپور نگاہوں سے اس نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ کار کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ایک ادائے مست ناز سے خراماں خراماں چلتی ہوئی گھر کی طرف مڑ گئی۔

وہ بہت خوش تھی۔ بہت مگن۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زمین پر نہیں ہواؤں پر اڑ رہی ہے اوپر آسمان کی بلندیوں میں۔ سرشاری کی کیفیت اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

گھر میں داخل ہو کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں گئی پرس ایک طرف ڈالا اور خود کو بستر کے حوالے کر دیا۔ اور آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت چھوٹی تھی جب گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی تھی۔ وہ یہی کہا کرتی تھی کہ اس کی گڑیا کسی شہزادی سے کم نہیں اس کی شادی تو وہ کسی راجکمار سے کرے گی۔ اس کی سہیلیوں کے پاس جتنے بھی گڈے گڑیاں تھیں سب کی شادی کہیں نہ کہیں ہو گئی تھی۔ لیکن اس کی گڑیا کنواری رہ

رہ گئی۔ اپنی گڑیا کے لائق راجکمار ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ خود شہزادی بن گئی تھی اور پھر اس کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ نکہت کے ماں باپ بھی اپنی بیٹی کو کسی شہزادی سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں بھی اس کے لائق کوئی راجکمار نہیں ملا۔ اپنی بیٹی کے لئے شہزادے کی تلاش میں سرگرداں اس کے باپ دور خلاؤں میں کھو گئے ------اور شہزادی کنواری رہ گئی------

واقعی بہت خوبصورت تھی وہ۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا قدرت نے اس حسین شاہکار کو بہت فرصت سے تخلیق کیا ہے۔ حسن کے بیان کی تمام تشبیہات اس پر آکر ختم ہو جاتی تھیں۔ یہی حسن اب اس کے لئے بے معنی بنتا جارہا تھا۔ کیونکہ چھتیس کا سن پار کرنے کے بعد اس کا حسن ابھی تک کنوارا تھا۔

کیوں——؟

اس کا جواب صرف اوپر والا ہی جان سکتا ہے۔ کیونکہ جوڑے تو عرش پر بنتے ہیں۔

وہ سب سے بڑی تھی۔ اس سے چھوٹا بھائی فرحان اور سب سے چھوٹی ایک بہن نزہت۔ باپ کے گزر جانے کے بعد ماں نے بڑی جدوجہد سے ان تینوں کی پرورش کی تھی۔ پڑھ لکھ کر اس نے ملازمت حاصل کرلی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب گلی محلّہ اور عزیز رشتہ داروں کے لڑکے بار بار اپنا پیام ڈائرکٹ اور ان ڈائریکٹ دونوں طریقوں سے بھجواتے۔ اس وقت نہ نکہت کا دل پسیجتا تھا نہ والدین کو کوئی لڑکا جچتا تھا۔ پھر تو حالات ہی اس قابل نہیں رہے۔ چھوٹا بھائی اور بہن تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کے پیروں پر کھڑا ہونے میں کافی وقت لگ سکتا تھا۔ گھر میں آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جب بھائی اس قابل ہوا تو اس نے اپنا گھر بسالیا۔ اب اس کے سامنے ایک بہن، اور ماں موجود تھیں۔ لہذا وہ نوکری کرتی رہی اور گھر چلاتی رہی۔ کب اور کیسے اس کی عمر بیت گئی اسے احساس ہی نہیں ہوا۔ یہ احساس تو اسے

تب ہوا جب اس کی بجائے نزہت کے رشتے آنے شروع ہوگئے۔ جو بھی پیام آتا اس کی عمر زیادہ بتا کر نزہت کا پیام دے دیتا۔ نزہت صورت شکل کی معمولی تھی اور اسے کوئی شہزادہ بھی درکار نہیں تھا۔ شاید وہ زیادہ سمجھدار نکلی۔ اس نے خاموشی سے اپنی پسند کے لڑکے سے سول میرج کی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اوپر والے کے یہاں شاید اس کا جوڑا بنا ہی نہیں۔

عمر کے اس حصہ کو پہنچتے پہنچتے اس میں ایک عجیب قسم کی بے پروائی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ صرف اپنی ذات میں گم رہنے لگی تھی۔ ماں، بھائی، بہن اور ان کی اولادوں کے لئے جذباتی ہونا اب اس نے چھوڑ دیا تھا۔ یکسانیت کے علاوہ ایک ٹھہراؤ اس کی زندگی میں آگیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک جذبہ کی شدت اس کے اندر بیدار ہوئی تھی۔ بہت عجیب و غریب جذبہ کی۔ وہ خود اس تبدیلی پر حیران تھی کہ اسے یہ کیا ہو رہا ہے اور یہ شدت ہر روز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ یہ شدت تھی خود سپردگی کے جذبہ کی —— اس کا دل چاہتا وہ اپنا آپ کسی کے حوالے کر دے۔ اپنا تمام وجود کسی کو سپرد کر کے چھوڑ دے۔ اس کی تکمیل مکمل ہو جائے۔ وہ ادھوری ہے ادھوری۔ اس دن نکہت بہت دیر تک باتھ روم میں پانی کی ٹب میں پڑی رہی۔ پانی کی ٹھنڈک سے وہ اپنے وجود کو کھنگالتی رہی۔ ایک سکون سا اندر ہی اندر میسر ہوتا رہا۔ پھر اس نے اپنی پسند کے کپڑے پہنے ہلکا سا میک اپ کیا —— خود کو بار بار آئینہ میں دیکھا خوبصورت عمارت کے نقش و نگار ابھی صحیح سلامت تھے اور دعوت نظارہ دے رہے تھے۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی رات کے نو بج رہے تھے۔ نکہت نے ایک ادائے دلبری سے اپنا بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکایا اور گھر سے باہر نکل گئی —— ایک ڈیڑھ گھنٹے تک وہ بے مقصد سڑکوں اور بازاروں میں گھومتی رہی۔ یہاں تک کہ بازار کی رونق پورے شباب پر آنے کے بعد اب ہلکی ہونے لگی تھی۔ سرمئی رات

اپنا آنچل پھیلا چکی تھی اندھیرا گہرا اور سیاہ ہونے لگا تھا۔ تھک ہار کر وہ ایک بس اسٹاپ پر کھڑی ہو گئی —— کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی ساڑھے دس بج رہے تھے۔ دو چار لوگ بس کے انتظار میں کھڑے تھے تھوڑی دیر میں وہ بھی بس میں چڑھ گئے۔ وہ اکیلی رہ گئی —— یکایک ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دو مرتبہ اس کے آگے پیچھے سے گزرا۔ نہ جانے کیا بڑبڑ کر رہا تھا۔ کچھ اشارہ بھی کر رہا تھا۔ قریب سے گزرا، شراب کا بھپکا نکہت کے نتھنوں میں گھسا تو اسے کراہیت کے ساتھ ساتھ متلی بھی آنے لگی۔ اپنے اشارے کا جواب نہ پاکر تھوڑی دیر کھڑا رہ کر وہ چلا گیا۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک اسکوٹر اس کے سامنے آکر رک گیا۔ اندر ہی اندر اس کا دل دہشت کے مارے دھڑ دھڑ دھڑک رہا تھا۔ نکہت کو دیکھ کر وہ بہت بھدے انداز میں مسکرایا۔ بار بار نکہت کے آگے لفٹ لینے کے لئے انگوٹھا دکھایا —— نکہت منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی —— تو اس نے فقرہ چست کیا سیٹ خالی ہے آؤ بیٹھ جاؤ۔ جہاں جاؤ گی ہم چھوڑ دیں گے۔ جی نہیں شکریہ —— میں خود چلی جاؤں گی۔ تبھی ایک پولس والا سیٹی بجاتا ہوا ادھر سے گزرا تو نکہت نے اطمینان کی سانس لی —— میڈم آپ کو کدھر جانا ہے —— ؟اب یہاں بس نہیں آئے گی۔ بس کا ٹائم ختم ہو چکا —— جی —— میں تھری وہیلر کا انتظار کر رہی ہوں —— وہ وہاں ملے گا —— آگے چوراہے پر —— اور وہ پیدل وہاں سے چل پڑی —— وہ سوچنے لگی کس قدر واہیات اور گھنونے قسم کے مرد تھے یہ۔ توبہ توبہ —— کہاں اس کے تصور میں بسا ہوا شہزادہ اور کہاں..... اس نے دل ہی دل میں لاحول پڑھا اور تیز تیز قدم بڑھاتی چلتی چلی گئی۔۔۔ وہ جلد سے جلد اسکوٹر تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اسی وقت نیلے تیز رنگ کی ایک چمچماتی کار اس کے قریب آکر رکی۔ اس سے تقریباً دس قدم آگے —— کار کے نزدیک پہنچ کر نکہت کے قدم خود بہ خود رک گئے —— ایک چہرہ اس کی طرف

جھکا ہوا تھا۔ نکہت کی نظریں ملیں تو وہ محو حیرت رہ گئی۔ بالکل اس کے تصور کا شہزادہ —— وہی راجکمار —— کار کا دروازہ کھل چکا تھا وہ اس کے برابر میں بیٹھ گئی —— بہت پُر سکون —— اسے لگ رہا تھا وہ دور کہیں آسمان کی نیلی وسعتوں میں اڑی چلی جا رہی ہے اپنے راجکمار کے ساتھ۔

آپ کا نام ——

وہ چونکی —— جی —— نکہت ——

اس حسن کو لے کر اکیلے —— ان سڑکوں پر —— اتنی رات گئے۔؟؟

میں اکلی کہاں ہوں؟؟

وہ مسکرایا —— اور نکہت کو خالق کائنات کے معصوم فرشتوں کے وجود کا یقین اور پختہ ہو گیا۔ گاڑی سنسان سڑک پر فراٹے بھرتی رہی ——

کہاں ڈراپ کروں ——؟؟

جی —— وہ پھر چونکی —— کچھ کہا آپ نے؟؟

آپ کو کہاں ڈراپ کروں ——

وہاں —— جہاں لال قلعہ کی حد ختم ہوتی ہے گاڑی کچھ ہی منٹوں میں ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ نکہت نے بھرپور نگاہوں سے اس نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور اپنے راستہ پر چل دی —— وہ اوپر سے نیچے تک سرشار تھی۔۔۔ اس کی روح کو تسکین مل گئی تھی۔ اس نوجوان کے پاکیزہ قرب سے اسے ایک ایسی لذت کا احساس ہوا تھا جس نے اس کے بال و پر پوری طرح سے کھول دیئے تھے۔ اس کا وجود مکمل ہو گیا تھا —— خود سپردگی اور جسمانی لذتوں سے اس نے خود کو آزاد پایا —— اب ایسا کوئی جذبہ اس کے اندر گہرائی تک کہیں نہیں تھا اور وہ گہری نیند سو رہی تھی ——

☆☆☆

نسبندی

نسبندی

کیلاش بابو منھ لٹکائے گھر میں داخل ہوئے تو مالتی نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیوں۔ کچھ کام بنا"۔

"نہیں" کیلاش بابو جھنجھلا کر بولے

کیوں تمہاری اس بے داغ نوکری کو کیا ہوا جس پر تمہارے بڑے بابو فخر کرتے تھے۔

"وہ مجبور ہیں۔ انہیں بھی تو نوکری کرنی ہے۔"

"اور ڈائریکٹر صاحب۔"

"وہ کیا کریں گے؟ انہیں نے تو معطّلی کے آرڈر دیئے ہیں۔"

"اس سے ان کو کیا فائدہ۔ ساری مصیبت تو غریب آدمی کی ہے۔"

"اب تجھے میں کیا سمجھاؤں۔ جتنے زیادہ کیس ان کے محکمہ سے جائیں گے اتنی

ہی جلدی ان کی ترقی ہو گی۔"

"پچھلی تنخواہ بھی دی۔"

"نہیں ـــــ اس کے بھی ابھی آرڈر نہیں آئے" "ہے بھگوان" کہہ کر مالتی نے ایک لمبی آہ بھری اور خاموش ہو گئی۔

تین مہینے سے تنخواہ نہ ملنے سے اس کے زیور بک چکے تھے۔ صرف دو کنگن رہ گئے تھے جو ظاہر تھا اس مہینہ میں برابر ہو جائیں گے۔

"مالتی ـــــ کیلاش بابو نے آہستہ سے آواز دی۔"

"ہوں ـــــ مالتی نے آہستہ سے ہنکارا بھرا۔"

"سو رہی ہو۔"

"نہیں" ـــــ منی اور پپو کو سلا رہی ہوں۔ بولو کیا بات ہے۔"

کچھ نہیں ـــــ میں سوچ رہا ہوں کب تک اس طرح گرہستی چلے گی۔ نسبندی کرا ہی لوں۔ اب گورنمنٹ سے لڑا تو نہیں جاتا۔ اور لڑ کر کروں بھی کیا۔ کہیں دوسری جگہ بھی اب تک نوکری نہیں ملی۔

تم کیوں کراتے ہو۔ کرانی ہے تو میں کرا لیتی ہوں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ایشور نے دو دیئے ہیں ان دو کو ہی پال لیں گے۔ اور نہ سہی۔

وہ تو ٹھیک ہے یہ دو ہی پل جائیں گے۔ وہ بات نہیں۔ مگر ـــــ کیلاش بابو کہتے کہتے رک کر پھر سوچنے لگے مگر کیا ـــــ اب چھوڑو اس زمانے کو جب تمہارے آٹھ چاچا تھے اور آٹھ بوائیں۔ کتنا سستا تھا۔ تمہارے دادا سو روپیہ مہینہ میں سب کو پال گئے۔ اور اب تم آٹھ سو کی تنخواہ میں کیا کیا کر لیتے ہو۔ مالتی نے کہا۔

کیوں سو گئے کیا؟

نہیں ـــــ جاگ رہا ہوں کل ہی ہو آؤں؟ نہیں میں چلی جاؤں گی۔ تم چاہو تو

نمیرے ساتھ ہی چلنا۔ تم کیسے کرا سکتی ہو ـــــ یاد نہیں ـــــ ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔ تم رہنے دو۔ میں ہی چلا جاؤں گا۔ اجی چھوڑو۔۔۔ کیا ہوا تھوڑا وزن بڑھ جائے گا یا موٹی ہو جاؤں گی تو۔

موٹاپے کا فکر تو اتنا نہیں۔ دل کی بیماری کا کیا ہو گا۔

اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ان دونوں کا کیا ہو گا۔

دوسری لے آنا ـــــ مالتی نے چٹکی لی۔

اجی ہاں ـــــ اتنا آسان ہے۔ دوسری لے آنا۔ بوڑھی گھوڑی لال لگام۔ کیلاش بابو ہنستے ہوئے بولے۔

گھوڑے سے گھوڑی کب بنے۔ مالتی چہکی۔

ارے مرد اور گھوڑا کبھی نہ ہو بوڑھا۔

کس پرانے زمانے کی باتیں کرتی ہو۔ جب ایک دھڑی کا گھی اصلی ملتا تھا اب پانچ کیا دس روپیہ میں بھی ایک سیر ونا سپتی نہیں ملتا۔

ڈیڈی ـــــ یہ دھڑی کیا ہوتا ہے؟ پپو نے پوچھا ـــــ

کیا ـــــ کیلاش بابو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ابھی تک تم سوئے نہیں؟

نہیں ڈیڈی ـــــ نیند نہیں آئی۔ منی نے بھی چہکارا بھرا۔

مالتی۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ انہیں سلا رہی ہوں۔ یہ تو دونوں جاگ رہے ہیں۔ شاید تم خود ہی سو گئی ہو۔

ہاں ڈیڈی ـــــ ممی تو سو رہی ہے ـــــ پپو نے کہا۔

اچھا۔ اچھا ـــــ بس اب دونوں سو جاؤ ـــــ شیطان کہیں کے۔

منی تجھے پتہ ہے ممی ڈیڈی کہاں گئے ہیں۔ پپو نے بستہ رکھتے ہوئے کہا۔

نسبندی کرانے۔ منی نے بڑی بوڑھیوں کی طرح جواب دیا۔ نسبندی کرانے۔
پپو نے حیرت سے اس کی بات دہرائی ہاں ہاں نسبندی کرانے۔ منی نے پھر کہا۔
وہ کیا ہوتی ہے۔ تجھے پتہ ہے کیا؟
اری میڈم نے آج ہمیں ڈانٹ دیا۔ ٹنکو نے میڈم سے یہی پوچھا تھا۔ پٹتے پٹتے بچ گیا۔ پپو نے بتایا۔
ہاں مجھے تو پتہ ہے نسبندی کیا ہوتی ہے۔ دیکھو یہ نس۔ منی نے کلائی دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کو کاٹ دیتے ہیں۔ اس سے لوگ موٹے اور خوشحال ہو جاتے ہیں۔ تو نے پڑھا نہیں۔ کتنی جگہ لکھا رہتا ہے۔
"خوشحالی کا راز۔ نسبندی کرایئے۔"
"چل۔ پھر ہم دونوں بھی نسبندی کرا لیتے ہیں۔"
تیری نسبندی میں کر دیتا ہوں۔ تو سوکھ رہی ہے موٹی ہو جائے گی۔ اور میں خوشحال۔
پپو نے بلیڈ لے کر منی کی نسبندی کر دی تھی۔ منی کی کلائی سے خون کی دھار بہہ نکلی۔ دونوں اس بہتے خون کو دیکھ رہے تھے کہ نہ معلوم وہ کب بہنا بند ہو گا۔ منی آہستہ آہستہ خاموش ہوتی جا رہی تھی۔ پپو نے اسے جگایا بھی مگر وہ لیٹ کر سو گئی۔ فرش پر خون کافی بہہ چکا تھا۔ خون کو دیکھ کر پپو ڈر گیا اور ایک کونے میں دبک گیا۔
دھڑ دھڑ۔ دھڑ ادھڑ ادھڑ۔ دھڑ ادھڑ۔ ارے منی دروازہ کھولو —— پپو —— پپو —— دروازہ کھولو بیٹا —— منی دروازہ کھولو —— دھڑ دھڑ —— ارے سو گئے کیا —— منی او منی —— پپو —— مالتی چلائی۔ کہاں مر گئے بولتے کیوں نہیں —— ارے بیٹا کھولو تمہارے ڈیڈی کی طبعیت خراب ہے۔ منی پپو ——
اڑوس پڑوس سے آواز سن کر لوگ نکل آئے کیا ہوا بھابی۔

بھیا سمن، دروازہ اندر سے بند ہے۔ پپو منی اندر ہیں شاید سو گئے ہیں۔ بولتے ہی نہیں مالتی نے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ابھی لو ـــــ میں اندر جاتا ہوں۔

سمن سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھ کر ایک ہی جھٹکے میں اندر کود گیا اور کنڈی کھول دی۔ کیلاش بابو رکشا سے اترے مالتی ان کو لے کر اندر داخل ہوئی منی فرش پر لیٹی ہوئی تھی اور خون میں لت پت تھی۔ مالتی چیخی ہائے یہ کیا ہوا میری بچی کو ـــــ مالتی منی سے لپٹ کر پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ تبھی کونے میں دبکا پپو بہت تیزی سے باہر کی طرف نکل کر بھاگا۔ کیلاش بابو پپو کی طرف لپکے لیکن وہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔

دیکھنا بھیا سمن ـــــ ذرا پپو کو دیکھنا وہ کہاں بھاگا ہے۔ ادھر محلّہ کے کئی لوگ چلاتے ہوئے بھاگے چلے آرہے تھے ـــــ کیلاش بابو جلدی آؤ ـــــ پپو ٹرک کے نیچے آگیا ہے۔ جلدی آؤ کیلاش بابو ..... لیکن وہ وہیں چکرا کر گر پڑے۔ مالتی سینہ پیٹ پیٹ کر چلاتی رہی ہائے میرے بچے، میرے بچے، ایک طرف منی کی لاش پڑی تھی دوسری طرف ٹرک سے کچلی پپو کی لاش۔ کیلاش بابو بے ہوش تھے اور مالتی کی چیخیں بھی گلے میں گھٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

دور کہیں نسبندی کیمپ کا لاؤڈا سپیکر لوگوں کو سکھ کے راز سمجھا رہا تھا۔

☆☆☆

عکس

عکس

اف میرے خدا۔ یہ میں نے کیا دیکھ لیا..... میرا وجود پارہ پارہ ہو کر لرزنے لگا ہے۔ دل کی گھٹن بڑھتی ہی جارہی ہے..... کاش میں نے یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا۔ بچپن سے لے کر جوانی کے آخری لمحوں تک کی یادیں میرے ذہن کو جھنجھوڑنے لگیں۔ اس وقت میں کوئی چھ برس کی تھی۔ ایک صبح سوتے میں میری ران پر اتنی زور سے چانٹا پڑا کہ میں بلبلا کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف دیکھا کوئی نہ تھا۔ ابا جان کیاری کے پاس بیٹھے تازہ گلاب دیکھ رہے تھے اور حسب عادت قرآن پاک کی کوئی سورت بآواز بلند پڑھ رہے تھے۔ پوچھنے کی ہمت نہیں کہ کیا ہوا؟ خود ہی خیال کیا کہ غرارہ پہن کر سو رہی تھی شاید سوتے میں اوپر اٹھ گیا ہوگا۔ یہی ابا جان کے غصہ کی وجہ ہو سکتی ہے۔ کتنا غصہ تھا ابا جان کو۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔ امی جان کو ذرا ذرا سی باتوں پر کس بری طرح سے لتاڑتے تھے اور دوسرے ہی لمحہ ان

کے بغیر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے۔ جب ابا جان اسکول سے پڑھا کر آتے تھے تو کیا مجال گھر میں ذرا سی بھی کسی کی آواز نکل جائے۔ بقول امی کے "تمہارے باپ تھکے ہوئے آئے ہیں آرام کی ضرورت ہے" یہ تو کبھی سوچا ہی نہیں کہ بچے بھی اسکول سے تھکے ہوئے آئے ہیں کھیلنے اور چہکنے کی ضرورت ہے۔

بس رات کو ابا جان کسی نہ کسی نشست میں ضرور جاتے۔ یہ نام میں بچپن سے سنتی چلی آئی ہوں۔ تب ہم سب بہن بھائی مل کر خوب دھما چوکڑی مچایا کرتے تھے۔

بچپن کی وہی شرارتیں۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ ابا جان کی چیزیں بھی چپکے چپکے چھیڑنا شروع کیں۔ نہ معلوم ابا کو کیسے پتہ چل جاتا تھا۔ صرف غصہ سے آواز لگتی تو خون خشک ہونے لگتا۔ اور ڈانٹ پڑتی تو ڈر کے مارے پیشاب نکل جاتا کچھ پوچھا جاتا تو آواز ہی نہ نکلتی۔

جوں جوں بچپن جانے لگا توں توں سمجھ آنے لگی۔ ابا جان کی عادتیں کتنی عجیب ہیں۔ یا تو تمام کام خود کریں گے۔ ریڈیو خود ٹھیک کرلیں گے، بجلی کا کام بھی خود ہی کرلیں گے، پریس خود کھول کر بیٹھ جائیں گے، کتنی خوبصورت تصویریں بناتے تھے۔ کتنا خوبصورت ابری کاغذ بنایا کرتے تھے۔ کیا کیا کام کرتے تھے کہ بس.....
اور دوسری طرف گھڑے سے پانی لے کر بھی خود نہیں پی سکتے۔ ہم بچوں سے کبھی کھیلتے بھی نہیں۔ ہنسی مذاق بھی نہیں۔ اتنی سخت مزاجی کہ ہر بات کا آرڈر..... کسی بات میں نا سننے کی عادت تو جیسے تھی ہی نہیں۔

پانچ منٹ بھی کبھی انہیں اپنے اسکول پہنچنے میں دیر نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی پانچ منٹ ہمیں اسکول جانے میں دیر ہو جائے تو سارا محلّہ سر پر اٹھالیں گے۔ سالن میں نمک مرچ تیز ہو جائے تو سالن کا پیالہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنگن میں بکھر جائے۔ ہر وقت ہر کام قاعدے کا۔ نپا تلا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ ہر وقت

رعب ہی رعب۔ پاس بلاتے آرڈر ملتا بیٹھو۔ ہم بیٹھ جاتے۔ کہتے کہو بیس بار جھوٹ بولنا گناہ ہے، زبان میں گندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر کہتے کہو بیس بار دل کی بات نہیں مانتے دل غلط کام کرواتا ہے۔ کس قدر اکتا دینے والا بچپن تھا وہ۔ خدا کی پناہ.....

آہستہ آہستہ پتہ چلا کہ ابا جان شاعر ہیں۔ دل چاہا چوری چھپے پڑھیں ابا جان کیا لکھتے ہیں..... یقین نہیں آتا کہ اتنے سخت مزاج ابا جان شاعر ہو سکتے ہیں۔ شاعری بھی ایسی کہ آہ..... دل تڑپ اٹھے..... کیا ابا جان اندر سے اتنے نرم ہیں.....؟؟ کیا ابا جان کے دل میں بھی اتنے نرم گرم احساسات ہیں۔ بالکل یقین نہیں ہوتا..... باہر سے اتنے سخت دکھائی دینے والے ہمارے ابا جان اتنے حساس ہوں گے اور اتنا جذباتی کلام کہتے ہوں گے۔

تو پھر یہ غصہ؟؟ شاید خاندانی چلن.....

اب پوری طرح ہمارا شعور جاگ اٹھا تھا، اور ابا جان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے واضح ہو چکی تھی۔ ابا ہمیں آہستہ آہستہ بہت اچھے لگنے لگے۔ ہر بات میں مردانگی، حسن و وقار، نفاست پسندی، علمیت، اولاد کی پرورش کا ڈھنگ، سبھی کچھ ابا جان میں بڑے نرالے انداز میں موجود تھا۔ ابا کا سارا کام میں خود کرتی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ ابا بھی بہت خوش ہوتے۔ کہتے۔ واہ بیٹا شاباش..... بہت اچھا جوتا چمکایا ہے میرا.....

آہستہ آہستہ ابا کا مزاج بدلتا جا رہا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح غصہ نہیں ہوتے تھے۔ اب ابا جان کو کسی بات میں ہماری دخل اندازی بری نہیں لگتی تھی۔ ابا جان یہ کپڑے پہنئے..... یہ والا جوتا..... اور ہاں..... یہ والا سوئٹر..... اور یہ کالا سوٹ اور فلاں خوشبو لگا کر نشست میں جایئے گا آج..... لایئے ابا جان..... میں کاٹ دوں آپ کے ناخن..... بالکل گول کاٹوں گی۔ ذرا بھی کہیں نوک نہیں بچے

گی۔ابا مسکرا کر قینچی تھما دیتے۔

ایک دن ابا کے دوست جنہیں ہم چاچا کہتے تھے، موجود تھے انہوں نے فرمائش کی کہ کوئی تازہ غزل ہو جائے۔ ابا جان شروع ہوئے ..... آخر میں جب مقطع کہہ رہے تھے تو آخری لائن بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئی..... بڑے تعجب سے مجھے دیکھا۔جب چچا چلے گئے تو پاس بلایا..... بولے ذرا دہرانا اس وقت کیا سنایا تھا..... مارے ڈر کے کھڑے کھڑے پاؤں کپکپانے لگے۔ ہمت جواب دے گئی..... سمجھا کر بولے "یہ تمہارے پڑھائی کے دن ہیں، فضول کاموں کی طرف توجہ نہ دیا کرو۔

وقت گزرتا گیا۔ نہ جانے کس جذبہ کے تحت میں نے افسانے لکھنا شروع کیے۔ چپ چاپ طبع آزمائی کرتے کرتے ایک دن وہ آیا کہ چھوٹے معمولی پرچوں میں وہ افسانے چھپنے لگے۔ شوق بڑھتا گیا..... لیکن ابھی تک اتنی ہمت نہ تھی کہ ابا جان کو دکھا سکوں کہ کیسا لکھا ہے۔ ڈر تھا کہیں برسوں کا گیا طوفان پھر واپس نہ آجائے۔ اور پھر ایک دن امی نے تذکرہ کر ہی دیا..... قیامت آگئی..... سارے پرچے طلب کیے .....ڈرتے ڈرتے ہم نے وہ تمام پرچے لا کر دے دیئے جن میں ہمارے افسانے چھپے تھے۔

کئی دن بعد بلایا.....افسانہ لکھنے کی تمام باریکیاں سمجھائیں.....اور کہا آئندہ کسی پرچے میں بھیجنے سے پہلے کسی کو دکھا دیا کرو..... ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی..... .یہ کیا بات ہوئی.....؟؟

جیسے جیسے ہمارے قدم جوانی کی دہلیز پر بڑھتے رہے وہی ابا ہمارے آئیڈیل بنتے گئے۔ ان کی ہر بات میں آن اور ہر ادا میں شان اور وقار نظر آنے لگا۔ مجھے ابا جان سے اس قدر محبت ہوئی کہ جس کو ظاہر کرنا میرے بس میں نہیں..... تمام عزیزوں کی مرضی کے خلاف ابا جان نے مجھے سب اولادوں سے زیادہ پڑھنے کا

موقع دیا۔ ان کی نظر عنایت سب سے زیادہ مجھ پر رہتی تھی۔ ابا مجھ سے ہر طرح کی باتیں بے تکان کیا کرتے تھے۔ امی ٹوکا کرتیں تو کہتے تھے۔ "یہ بیٹی نہیں بیٹا ہے۔ زمانے کی اونچ نیچ اور اپنا تجربہ بتاتا رہتا ہوں..... تم ٹوکا مت کرو.....

کاش میں بھی ابا کو بتا سکتی کہ میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اپنا آئیڈیل اور میرے تصورات کا مکمل شاہکار نظر آتے ہیں۔ آپ ہر فن میں استاد ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے میں آپ کی تمام خوبیوں کی تعریف کروں۔

عمر کے تیس سال کیسے پر لگا کر اڑ گئے۔ سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وقت اور ماحول بدلتا جا رہا تھا۔ ابا کا خاندان طویل ہوتا جا رہا تھا اور امی خوش و خرم و مطمئن نظر آتی تھیں۔ ابا کا غصہ اولاد نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں نے ختم کر دیا تھا۔ سب ابا کے کندھوں پر چڑھے رہتے تھے۔ میری شادی کے بعد ابا بہت غمگین رہنے لگے تھے۔ ان کی والہانہ محبت کا ثبوت وہ خطوط ہیں جو وہ مجھے لکھتے رہے ہیں۔ اب ابا کمزور ہو چلے تھے۔ چوڑا چکلا سینہ نرم پڑنے لگا تھا خود کہا کرتے تھے۔ "اب ہم چراغ سحری ہیں" اور ایک دن ابا کا یہ کہنا درست ثابت ہوا۔ ایک ہی ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ ابا کی اچانک طبیعت خراب ہوئی۔ پروسٹریٹ کا آپریشن ہونے والا تھا۔ سارا گھر مہمانوں سے بھر گیا، ابا مسکرا مسکرا کر سب سے باتیں کر رہے تھے۔ گھر میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ جس کو جہاں جگہ ملی پڑ کر سو گیا۔ صرف میں ہی تورہ گئی تھی۔ ابا بھی سو چکے تھے۔ ہر بستر پر دو دو تین تین پڑے تھے۔ امی کو بھی بچوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ صرف ابا کا بستر خالی تھا۔ میں چپکے سے ابا کے لحاف میں گھس گئی۔ اور ان کی پیٹھ سے چپک کر ایسی سوئی کہ ہوش ہی نہ رہا..... سویرے ابا کلبلائے۔ ارے بھئی "یہ میرے پاس کون لیٹ گیا؟" "میں ہوں ابا جی"۔ ابا نے چھوٹے سے بچے کی طرح مجھے سینہ سے چمٹا لیا۔ میری آنکھیں محبت کے اس لمس

سے بھر آئی تھیں۔

آپریشن ہوا-- تیسرے دن ابا ہم کو چھوڑ کر چل دیئے۔ جس کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ پاگل ہونے کا گمان ہوتا تھا۔ وہ ہو چکا تھا۔

آہ ابا-- اب میں کس کے لئے لکھوں گی؟ کیسے لکھوں گی؟ کون خوش ہوگا؟ میرے اس ادبی ذوق کے جنم داتا مجھ کو--- تنہا چھوڑ کر---

کئی دن گزر گئے۔ ہر پل ابا کی باتیں ہوتی رہتیں۔ ابا سب کو خواب میں نظر آتے کسی کو کسی طرح کسی کو کسی طرح-- میرے دل کی خلش دل میں ہی رہی-- ابا مجھے نظر کیوں نہیں آتے؟؟ کیا مجھ سے ناراض ہیں--؟؟ زیادہ سے زیادہ تلاوت کرتی، درود و دعائیں پڑھتی۔ ثواب پہنچاتی۔ تصور کر کے لیٹتی۔ ابا نظر نہیں آتے-- کاش میں بھی ابا کو دیکھتی---- میں تو ابا کے سب سے زیادہ قریب تھی۔ بیماری میں بھی، زندگی میں بھی، خوشی میں بھی، غم میں بھی۔ ابا نے ایک دن کہا تھا مجھے صرف مہر میں اپنا عکس نظر آتا ہے۔ ابا نے ایک خط میں مجھے غزل لکھا تھا۔ ابا سب سے زیادہ مجھے چاہتے تھے۔ کیسا خوش ہوتے جب ابا کے پاؤں دھلاتی، سر دھلاتی، پھر کیا وجہ ہے؟ وقت گذرتا گیا-- میری بے چینی بڑھتی گئی-- ابا- کاش--- ایک بار مجھے بھی نظر آیئے---- کیسے ہیں؟ کہاں ہیں؟ آپ کی ایک ایک یاد میرے ذہن کے ٹکڑے ٹکڑے کئے دے رہی ہے..... ابا نظر آئے--- اف میرے خدا..... یہ میں نے کیا دیکھ لیا---؟؟ میرا وجود بکھر رہا ہے-- یہ سب کیا ہے----؟؟ ابا کی پاکیزگی اور میری والہانہ محبت کا یہ انداز---؟؟ ابا اور میں اتنے قریب----؟؟

☆☆☆

حصار

حصار

یہ لو—— دیکھ لو اپنی بیٹی کے کرتوت۔" مزمل نے بیٹی کی تصویر بیوی کے سامنے پٹختے ہوئے کچھ اس طرح کہا کہ زاہدہ کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ گئی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے تصویر اٹھائی، شوہر کی طرف دیکھا جس کی نظریں ابھی تک قہر برسا رہی تھیں۔ ان نگاہوں کی تاب نہ لا کر زاہدہ نے اپنی آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ لگایا اور تصویر کو دیکھنے لگی۔ دو تین لڑکوں کے بیچ اس کی بیٹی شاہدہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ساتھ میں اس کی ہمجولی شکیلہ بھی تھی۔

دیکھ لیا—— اور پڑھاؤ—— کہا تھا ہاتھ پیلے کر دو—— زمانہ خراب ہے—— بنالو ڈاکٹر—— وہ تو ہماری عزت کا ہی چیر پھاڑ کر دے گی۔

ارے جب عزت خاک میں مل جائے گی تو کس کام کی یہ پڑھائی؟؟

بولو—— میں پوچھتا ہوں پڑھائی عزت سے زیادہ ہے کیا——؟؟

زاہدہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ وہ بالکل خاموش بیٹھی رہی۔ آخر وہ بولے تو کیا بولے۔ اسے تو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس گھر کا ہر فرد تعلیم کے خلاف ہے۔ یہ تو بس اس کی منت سماجت اور خدمت گزاری کا نتیجہ تھا جو وہ اپنی بیٹی کو دسویں جماعت تک گھسیٹ لائی تھی۔

وہ خود نہیں پڑھ سکی تھی۔ اپنا کوئی ارمان پورا نہیں کر سکی تھی۔ اسی لئے اپنی تمام خواہشات اپنے تمام ارمان اپنی اولاد کے ذریعہ پورے کرنا چاہتی تھی۔ لیکن یہاں اس کے جذبات کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔

تصویر دیکھتے دیکھتے زاہدہ کی نظروں میں تصویر بدل گئی۔ وہ بھی بالکل ایسی ہی تصویر تھی۔ جس میں وہ خود تھی تین چار لڑکیاں تھیں جو اس کے سر کی شاگردہ تھیں۔

عید کا دن تھا وہ —— نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے چھوٹے بھائی کے ساتھ سوئیوں سے بھرا ٹفن لے کر وہ اپنے سر کے گھر گئی تھی۔ اس دن ان کے گھر بہت رونق تھی۔ کیونکہ ان کے بہت سے شاگرد لڑکے اور لڑکیاں عید کی مبارکباد دینے آئے ہوئے تھے اور سر کے ساتھ فوٹو کھینچوا رہے تھے۔ زاہدہ کو دیکھ کر سر نے بہت تپاک سے اپنے تمام شاگردوں کو ایک دوسرے سے ملوایا۔ زاہدہ کی انہوں نے بہت تعریف کی تھی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ کلاس میں اول آتی تھی۔

آؤ بھئی تم بھی ایک تصویر کھینچوالو ہمارے ساتھ، فاروق سر نے اسے اپنے برابر میں کھڑا کر لیا۔ کئی شاگردیں ادھر ادھر کھڑی ہو گئیں۔

جب یہ تصویر فاروق سر نے زاہدہ کو لا کر دی تو وہ تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ وہ تصویر اس نے اپنی کتاب میں رکھ لی تھی۔

زاہدہ ایک جاہل گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اس کے باپ درزی تھے۔ ان کی چھ اولادیں تھیں۔ چار بیٹے اور دو بیٹیاں۔ زاہدہ سے بڑے دو بھائی تھے۔ تیسرے نمبر پر

زاہدہ تھی۔ اس سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ اور آخری نمبر پر یعنی سب سے چھوٹی ایک بہن۔

بابا نے بہت کوششیں کی تھیں اولاد پڑھانے کی لیکن کسی کو بھی پڑھائی سے زغبت نہیں تھی۔ آخر کار بابا نے دونوں بڑے بیٹوں کو اپنے ساتھ کام پر لگالیا۔

زاہدہ کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسے بھی بھائیوں کی طرح اسکول بھیجا گیا۔ بھائیوں کے برعکس وہ دن رات پڑھتی رہتی تھی۔ وہ ہر مرتبہ کلاس میں اول آتی تھی لیکن جب نویں جماعت کا نتیجہ ملا تو وہ گھر آکر بہت روئی تھی۔ کیونکہ اول آنے کے بجائے وہ دوسرے نمبر پر تھی۔ حساب میں اس کے نمبر کم رہ گئے تھے۔ تب وہ کئی دن تک روتی رہی تھی۔ اس نے بابا کو بتایا تھا کہ ساری ہشیار لڑکیاں کسی نہ کسی سے ٹیوشن پڑھتی ہیں۔ کتنی مشکل سے بابا نے اسے ٹیوشن کی منظوری دی تھی۔ کیونکہ ٹیوشن پڑھانے والا عورت نہ ہو کر مرد تھا اور وہ بھی نوجوان۔

نویں جماعت میں وہ پھر اول آئی۔ اور دسویں جماعت میں چڑھ گئی۔ دسویں کے امتحان قریب تھے اور وہ دن رات تیاری میں لگی تھی۔

ایسا ہی ایک دن تھا۔ جب اس کے بھائی نے وہ تصویر اس کے بابا کے آگے پٹخ کر کہا تھا۔ ”بہت عزت بڑھا رہی ہے ہماری آپ کی لاڈلی۔“ کوئی اس تصویر کو دیکھ لے گا تو ساری عمر کنواری ہی بیٹھی رہے گی۔ بس —— بہت شوق ہو گیا —— کل سے اس ماسٹر کا آنا بند۔ ہماری عزت سے کھلواڑ کر رہا ہے سالا۔ پیٹھ میں چھرا بھونک رہا ہے۔ اب دروازے پر قدم دیکھ لئے تو ہاتھ پیر توڑ کر ڈال دوں گا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بابا بھی عزت کے ڈر سے خاموش ہو گئے۔ ماسٹر صاحب کا آنا بند کر دیا گیا۔ زاہدہ کی پڑھائی بند ہو گئی۔ اس نے کئی دن تک کھانا نہیں کھایا تھا مسلسل روتی رہی تھی۔ اس نے امی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بہت گڑگڑائی کہ اس کی

پڑھائی بند مت کرو۔ اس نے یہ بھی کہا تھا ٹیوشن نہیں لگانا تو نہ لگاؤ کم از کم اسکول جانے دو۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکی تھی کہ ایسا کون سا گناہ اس سے سرزد ہو گیا ہے جس کی اتنی بڑی سزا اسے دی جا رہی ہے۔ اس نے آخر ایسا کیا کیا ہے جس سے خاندان کی عزت پر بٹہ لگ گیا۔ اسے تو بابا کی عزت اپنی جان سے بھی زیادہ پیاری تھی۔ اس نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اور پھر بہت جلد کسی انجان آدمی کے ساتھ اس کی شادی کر دی گئی۔ اس گھر میں یعنی شوہر کے گھر اسے ایسا کچھ بھی میسر نہیں ہوا جس سے وہ خوش ہو سکے۔ اس کا شوہر خیراد مشین پر کام کرتا تھا۔ نقاہت ہر وقت اس کے چہرے اور جسم سے برستی تھی۔ مستقل کھنکھارتا رہتا تھا ہر وقت دوائیاں کھاتا رہتا تھا۔ وہ دق کا مریض تھا اور خون تھوکتے تھوکتے چھ مہینے کے اندر ہی اندر قبر میں پہنچ گیا۔ اس وقت شاہدہ اس کی کوکھ میں تھی۔

شادی کی خوشی تو اسے رتی بھر نہیں ہوئی تھی ہاں شوہر کے مرنے کا دکھ اسے بہت ہوا تھا۔ پھر شاہدہ پیدا ہوئی —— اس کی مسکراہٹوں اور کلکاریوں نے ہی زاہدہ کو توانائی بخشی تھی۔

ایک برس ہی گذرا تھا کہ ایک دن اس کے میکے اور سسرال والوں کے درمیان اس کا نکاح اس کے دیور کے ساتھ کر دیا گیا۔

پندرہ برس بیت گئے چھوٹا بیٹا بھی اب دس برس کا ہو گیا تھا۔ بس ایک ہی خواہش تھی اسے اپنی اولاد کو پڑھانے کی۔ اسی خواہش کو لے کر وہ زندگی جی رہی تھی۔

آج پندرہ برس بعد وہی سب اس کی بیٹی کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ بھی رو رہی تھی، گڑگڑا رہی تھی بالکل اسی کی طرح، جینے کا حق مانگ رہی تھی بالکل اسی کی طرح،

وہ بھی معصوم تھی بالکل اسی کی طرح،اس کا قصور کچھ بھی نہیں تھا بالکل اسی کی طرح.....

اس کی بیٹی اس کے قدموں سے لپٹی زاروقطار رورہی تھی۔ وہ ساکت تھی لیکن اندر روح پھڑ پھڑارہی تھی۔اس نے لرزتا ہاتھ بیٹی کے سر پر رکھااور آنکھیں موندلیں۔ برسوں سے جامد خون کے قطرے اس کی آنکھوں سے پگھل کر رخساروں پر ڈھلک آئے۔اسی وقت اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ بیٹی کو گھسیٹ کر ایک طرف ڈال دیااور بیوی کے گال پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔اور برس پڑا---- تیرے اس لاڈ پیار نے ہی تو اسے بگاڑا ہے، تو ماں ہے یا چھینال------ بول ------ یہ سب تیرے ہی کرتوت ہیں.....

تھپڑ کھانے کے بعد زاہدہ سنبھلی---- اور اپنی تمام قوت بٹور کر وہ دہاڑی----بس ------ خاموش------ ہاتھ میرا بھی اٹھ سکتا ہے---- میری بیٹی پڑھے گی ضرور پڑھے گی.....

بیوی کی مضبوط آواز اور اٹل قوت ارادی دیکھ کر مزمل بھونچکا سارہ گیا---- زاہدہ پُر سکون تھی---برسوں سے پھڑ پھڑاتی روح قید خانے کا حصار توڑ چکی تھی۔

☆☆☆

لمحے

لمحہ

دروازہ کھولا تو اسے یوں سامنے کھڑا دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔

"تم۔"؟

"کیا اندر آسکتا ہوں۔۔۔۔؟؟"

"ہاں ہاں آؤ۔"

ایک ہی نظر میں اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ اپنے بریف کیس کو ایک طرف رکھا اور صوفے پر اس طرح دراز ہوا جیسے مانو تھک کر چور چور ہو رہا ہو۔ دو تین مرتبہ بالوں میں انگلیاں پھیریں جیسے تھکن کا احساس کم کر دینا چاہتا ہو۔

"کیسے آنا ہوا؟ کب آئے؟"

"صبح آیا تھا۔۔۔ ویزا کے چکر میں بھٹکتا رہا۔ اب بھی کام مکمل نہیں ہوا۔ کل پھر جانا ہے۔ کام ہو جاتا تو آج ہی واپسی کا ارادہ تھا۔"

"مجھ سے ملے بغیر ہی--؟" نہ چاہتے ہوئے بھی یہ الفاظ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گئے۔

"نہیں ایسی بات نہیں---"

وہ میرے وطن کا تھا۔ اس کا نام ندیم تھا۔ لمبی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ دفتروں میں بھٹکتے بھٹکتے یقیناً وہ بہت تھک گیا ہو گا۔

میرے دل نے کہا سیدھے ادھر آتے، نہادھو کر آرام کرتے پھر کام کے لئے نکلتے۔ میں کیا تمہاری اپنی نہیں تھی؟؟

لیکن یہ سب تو میرے دل نے کہا تھا زبان نے نہیں---اور---اور وہ شاید دل کی بات کہنا اور سننا بھول گیا تھا۔ بھولتا بھی کیوں نہیں----مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا کہ اس کی گھریلو زندگی اچھی نہیں گذر رہی ہے۔

"تمہارے وہ کہاں ہیں؟؟"

"وہ تو تمہیں نہیں مل سکیں گے۔"

"لیکن کیوں---" بڑا اشتیاق تھا ان سے ملنے کا۔ آخر ایسی کیا بات ہے"؟

"وہ یہاں موجود نہیں۔"

"مجھے بہت افسوس رہے گا ان سے نہ ملنے کا۔"

"مجھے بھی افسوس رہے گا اس بات کا۔ اتفاق ہے کہ وہ اس وقت شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ کل ان کی دادی کا انتقال ہو گیا ہے اور وہ بجنور گئے ہوئے ہیں۔ شاید کل یا پرسوں تک آئیں گے۔"

"اوہ---" اس نے انتقال پر رسماً افسوس ظاہر کیا۔

"بچے کہاں ہیں تمہارے---؟ کتنے ہیں؟ کیا یہی ایک بیٹا ہے"؟

"دو بیٹے ہیں۔ بڑا آٹھ برس کا ہے چھوٹا یہی ہے۔ بڑے بیٹے کو یہ ساتھ لے

گئے ہیں۔ کہتے تھے پر دادی کو آخری مرتبہ دیکھ لے شاید یاد رہیں۔"

"پھر تو میں غلط وقت پر آگیا ہوں۔ تم اکیلی ہو شاید — مجھے یہاں رکنا نہیں چاہئے۔"

"اب آ ہی گئے ہو تو رک جاؤ۔۔ کہاں ہوٹل دیکھتے پھرو گے۔ یہ ایسے گئے گذرے بھی نہیں۔ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"مجھے لگا کہ اسے شاید اس آخری جملے کی امید نہیں تھی۔ ہوتی بھی کیسے؟ اچھا نہالو--- میں چائے بناتی ہوں۔

وہ نہا کر نکلا تو میں چائے تیار کر چکی تھی۔

"اور سناؤ کیا کر رہے ہو"؟

"وہی ٹھیکیداری--- جنگلات کا کام۔"

"کتنے بچے ہیں؟"

"دو۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔"

"بیوی کیسی ہے تمہاری؟ اچھی ہی ہو گی۔ پیسے والی تو یقیناً ہو گی۔" آخری جملہ کہہ کر میں نے خود ہی خجالت سی محسوس کی۔

"ہاں اچھی ہی ہے کیونکہ امی اپنی پسند سے لائی ہیں۔ سارا گھر جہیز سے بھر گیا تھا۔ لیکن تمہارے ساتھ ناانصافی کی سزا مل گئی انہیں۔ امی اور والد صاحب آخری دنوں میں تمہیں بہت یاد کرتے تھے۔"

"کیا دونوں.....؟"

"ہاں---" اس نے ایک سرد آہ کھینچی۔

ساری گذری ہوئی باتیں جنہیں میں بھول چکی تھی یاد آنے لگیں۔ ہم دونوں نے چار سال ایک ساتھ گذارے تھے۔ پڑوس کی شناسائی کالج میں پروان چڑھ گئی تھی۔ اتنی پروان چڑھی کہ ایک ساتھ جینے اور ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے

قسمیں اور وعدے کئے تھے۔ لیکن ندیم کے ماں باپ پر تو جہیز کا بھوت سوار تھا۔ میں تو معمولی گھرانے کی لڑکی تھی اور پھر ویسے بھی میرے والدین ہمیشہ سے جہیز لینے اور دینے کے حق میں نہیں تھے۔ مجھے بھی اپنی انا اور ماں باپ کی عزت پیاری تھی۔ ندیم کے لاکھ کہنے کے باوجود بھی میں نے اس سے سول میرج نہیں کی۔ بس یہی وجہ ہم دونوں کی علیحدگی کا سبب بن گئی۔

اب پورے دس برس بعد ندیم کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی کی جدوجہد، خوشیاں اور غم، اس کے تمام وجود سے ظاہر تھے۔ بال کھچڑی ہو گئے تھے، صحت بھی کوئی بہتر نہیں تھی۔ طبیعت میں ڈھیلا پن آگیا تھا۔

"ندیم--- تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے واقعی دس برس بیت گئے۔"

"صرف دس برس---؟ مجھے تو لگتا ہے میرے اوپر سے صدیاں گذر گئی ہیں۔"

اس ایک جملہ نے اس کی کہانی کہہ دی تھی۔

میرا دل چاہا کہ --- لیکن اس سب کی قصوروار میں نہیں تھی۔ کیا میں نے کچھ نہیں جھیلا؟ شاید اس سے بھی زیادہ..... یہ اور بات ہے کہ میں نے خود کو ٹوٹنے نہیں دیا، بکھرنے نہیں دیا ورنہ۔

"تم واقعی بہت خوش قسمت ہو پاکیزہ--- تمہیں دیکھ کر یقین ہو گیا ہے کہ تمہیں سب کچھ پہلے سے بہتر ملا ہے۔ تم اس کی مستحق بھی تھیں۔ کافی مطمئن لگتی ہو یا پھر حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے"؟

"سمجھوتہ تو تم جیسے لوگ کرتے ہیں۔ زندگی میں سب کچھ تو نہیں مل جاتا؟ میں بہتر سے بہتر زندگی جینے کے حق میں ہوں اسے چاہو تو سمجھوتہ کہہ سکتے ہو۔"

مجھے لگا کہ شاید میرا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا ہے۔

"میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ گئی۔

اور وہ میرے بیٹے سے باتیں کرنے میں محو ہو گیا۔

کھانے کے دوران ہم دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اپنے تمام ساتھیوں کی، دوستوں کی، پڑوسیوں کی، کسی کے مرنے کی، کسی کی شادی کی----

"پاکیزہ---کیا تم ہمارے گھر کے آنگن کا وہ ککروندے کا پیڑ بھی بھول گئیں جس کے تم نے بہت ککروندے کھائے ہیں؟"

"تم یہ بات کیوں جاننا چاہتے ہو کہ مجھے کیا یاد ہے اور کیا نہیں؟"

"میں یہ اندازہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو میں سوچتا تھا وہ سچ تھا یا غلط"۔

"تم سوچتے ہی غلط ہو۔ اپنی سوچ کا زاویہ بدل دو۔ لمحوں کے کرب سے باہر نکل آؤ۔ سب کچھ خود بہ خود ٹھیک ہو جائے گا۔"

باتیں کرتے کرتے کافی رات گذر گئی۔ ندیم اب تم آرام کرو۔ میں اٹھتی ہوں اور یوں دوسرے کمرے میں میں نے ندیم کے آرام کا بندوبست کر دیا۔

رات تقریباً آدھی بیت چکی تھی۔ نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بیٹا میری بغل میں آرام سے سو رہا تھا اور میں دس سال پرانی کڑیوں کو جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اچانک ندیم کے کمرے کی لائٹ روشن ہوئی۔ مجھے کئی وسوسوں نے ایک ساتھ گھیر لیا۔ وہ باہر نکلا۔

"پاکیزہ---پاکیزہ---سو گئیں کیا---"

میں چپ سادھے پڑی رہی۔ کوئی جواب نہ پا کر اس کے قدم واپس مڑ گئے۔ پھر اس نے صدر دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آ گیا۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں پر سلگ رہا تھا۔ اس نے صدر دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

میں نے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ سونا چاہا لیکن مجھے پھر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں پھر اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن یہ میرا وہم تھا۔

چاہتی تھی کوئی میگزین کوئی کتاب پڑھوں تاکہ فضول باتیں سوچنے سے بچی رہوں۔ لیکن میں یہ بھی تو ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ میں جاگ رہی ہوں۔

لیکن وہ بھی تو نہیں سویا۔ اب تک جاگ رہا ہے۔ دن بھر کی تھکان کے باوجود--- آخر کیوں؟ وہ شاید پھر اٹھا ہے۔

"پانی--- پانی تو میں رکھ آئی تھی جگ میں--- کیوں اٹھا ہے وہ--- کہیں ادھر تو نہیں آ رہا۔ اس مرتبہ شاید وہ باتھ روم گیا تھا۔ اب شاید وہ باتھ روم سے نکل آیا ہے---- شاید اب وہ لائٹ بند کرے اور سو جائے۔ لیکن--- اس کے کمرے کی لائٹ جلتی رہی۔

رات یوں ہی آنکھوں آنکھوں میں گذر رہی تھی۔ تین بج چکے تھے۔ سر میں شدید بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے ایک مرتبہ پھر میں نے سونے کی کوشش کی۔

پھر آہٹ--- آواز---- گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ سامنے ندیم کھڑا تھا۔

"ایک کپ چائے ملے گی؟"

"اوہ--- گھڑی پر نگاہ ڈالی سات بج رہے تھے۔ یعنی میں سو گئی تھی۔ آنکھیں اب بھی بوجھل تھیں۔

چائے لے کر جب میں ندیم کے کمرے میں گئی تو سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں سے میں نے ایش ٹرے کو بھرا پایا اتنا کہ کئی ٹکڑے ایش ٹرے کے باہر بھی گرے پڑے تھے۔ اور ندیم کی آنکھیں میری آنکھوں سے بھی کہیں زیادہ بوجھل اور سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے سکون کا سانس لیا وہ کمزور لمحہ گذر چکا تھا۔ ☆☆☆

نگینہ

نگینہ

کیا کہا---؟؟ ذرا پھر سے کہنا---------؟؟

آپا-----ابرار بھائی شادی کر رہے ہیں۔

تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے---------ابرار اور شادی؟

نگینہ کو اپنی چھوٹی بہن فرینہ کی بات پر یقین نہیں آیا۔ اسے لگا فرینہ اس کے ساتھ مذاق کر رہی ہے۔ لیکن یہ مذاق نہیں حقیقت تھی۔ نگینہ کو محسوس ہوا آہستہ آہستہ اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک رہی ہے اور وہ معلق ہوا میں یوں ہی لٹک رہی ہے۔

ابرار نگینہ کے چچا کا بیٹا تھا۔ چار بہنوں کا ایک بھائی۔ نگینہ حالانکہ اپنے گھر کی پہلی اولاد تھی لیکن یہ پہلی اولاد سات برس گذر جانے کے بعد بڑی منتوں اور مرادوں سے پیدا ہوئی تھی اور اس کے پیدا ہوتے ہی چچا نے اپنے بیٹے ابرار سے

منسوب کرلیا تھا یہ کہہ کر کہ "بھیا مرادوں کی یہ بیٹی تو بس مرادوں کے بیٹے ابرار کے لئے ہی ٹھیک رہے گی"۔ اشفاق احمد اور اشتیاق احمد دونوں سگے بھائی تھے بھلا چھوٹے بھائی کی اس قدر و محبت کو اشتیاق احمد کیسے نظر انداز کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھی بات کو گرہ میں باندھ لیا۔

نگینہ تین برس کی ہوئی تو اشتیاق احمد کے یہاں ایک اور بیٹی پیدا ہوئی اس کا نام فرینہ رکھا گیا۔ دونوں بہنیں اسکول جاتی پڑھتی لکھتی اور کھیلتی کودتی بڑی ہونے لگیں۔ اشتیاق احمد کی عمر نے وفا نہ کی ان کے گردے خراب ہو گئے اور وہ بیوی اور دونوں بیٹیوں کو بے سر و سامانی کی حالت میں چھوڑ کر اپنی راہ پر چل دیئے۔ تمام اثاثہ بیماری کی نذر ہو چکا تھا۔ صرف یہ مکان بچا تھا جس میں یہ چھوٹا سا خاندان آباد تھا۔

اشتیاق احمد کی زندگی میں ہی عزیزوں نے نظریں پھیر لی تھیں۔ موت کے بعد تو سب بالکل پرائے ہو گئے۔ یہ تینوں افراد زندگی کی چکی میں پسنے لگے۔ نگینہ اس وقت چودہ برس کی ہو کر پندرہ میں لگی تھی اور فرینہ بارہویں برس میں۔ اس چھوٹے سے خاندان کی گذر پینشن کے مختصر سے روپیوں میں ہونا مشکل ہو گئی تو یہ چھوٹا سا خاندان گھر کے اوپری حصہ میں سمٹ آیا اور نیچے کا مکان دو حصوں میں تقسیم کر کے کرائے پر دے دیا گیا۔ باپ کا سایا اٹھ جانے کے بعد جو محبت چچا چچی سے ملنی چاہئے تھی وہ تو کیا ملتی رہے سہے تعلقات میں بھی بدلاؤ آنے لگا تھا۔ نگینہ جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی اسے یہ یقین ہوتا گیا کہ اس کے چھوٹے سے گھر کے سامنے چچا کے گھر کے در و دیوار اونچے ہی نہیں بہت اونچے ہو گئے ہیں۔ اور یوں نگینہ کے ٹھیکرے کی مانگ ایک بھولی بسری یاد بن گئی۔ شاید یہیں سے نگینہ کے اندر ایک نئی نگینہ پیدا ہو گئی تھی۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کرنے کے بجائے نگینہ نے فرار کا راستہ اختیار کر لیا۔

ابرار اور نگینہ پل بڑھ کر جوان تو ہوگئے لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ ابرار تعلیم اور اپنے کیریئر کے لئے جتنا سنجیدہ تھا نگینہ اتنی ہی بے پرواہ۔ وہ عشق و محبت کی پینگیں بڑھانا چاہتی تو ابرار ان باتوں کو فضول کہہ کر خود کو کتابوں میں غرق کر لیتا۔ نگینہ کو کتاب کے ہر ورق پر محبت لفظ کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ابرار نگینہ کے دل کا حال نہ جان سکا لہٰذا ایک ہی منزل کے دونوں مسافر الگ الگ راستوں پر چلتے رہے۔

شکل و صورت قد و قامت اور رنگ روپ کے لحاظ سے نگینہ پرکشش تھی۔ ادائیں بھی بڑی جان لیوا تھیں۔ ہر کام کا اس کا ایک خاص انداز تھا۔ اس کی چال بھی مخصوص تھی۔ اور بات کرنے کا ڈھنگ بھی نرالا جسم کے خدوخال کچھ اس انداز سے پوشیدہ رکھتی کہ اور زیادہ نمایاں ہو جاتے۔ آنکھ اٹھا کر بھی کسی کو نہ دیکھتی اور کتنوں کو ہی اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔ بوڑھا ہو یا جوان خود بہ خود نگینہ کی طرف جھکنے لگتا۔ وہ بھی ہر کسی کا دل جیتنے میں ماہر تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس ایک انار کے سو نہ سہی درجنوں بیمار ضرور تھے۔ نگینہ اپنے ہر بیمار کو کسی نہ کسی طرح اٹنڈ ضرور کرتی۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا کہ دو دو عاشق ایک ساتھ نگینہ سے ٹکرا جاتے۔ اس وقت نگینہ اپنی نگاہوں سے کچھ ایسی آنچ پہنچاتی کہ دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن ہو جاتے۔ نہ معلوم اتنے ہنر نگینہ نے کہاں سے سیکھ لئے تھے۔ گھر خاندان میں تو دور دور تک کہیں کوئی ایسا نہیں تھا۔ دلچسپ بات یہ ہوتی کہ نگینہ کے یہ عاشق آپس میں ایک دوسرے سے ٹکراتے لیکن پھر بھی نگینہ کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ ان عاشقوں میں کنوارے، بیاہے اور بوڑھے سبھی شامل ہوتے۔ ان عاشقوں کے علم و ہنر کا بھی کوئی معیار نہیں تھا۔ ہر ایک سے نگینہ کے عشق کی نوعیت بھی مختلف ہوتی۔ یقیناً وہ دل کی بہت سخی تھی۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنے ان عاشقوں کے قصے وقتاً فوقتاً چبا چبا کر اپنی

خاص سہیلیوں کو سناتی رہتی اور ہر ایک سے کسی کو نہ بتانے کی تلقین بھی کرتی رہتی۔

اپنے بارے میں نگینہ کا خیال تھا کہ وہ بہت سیکسی ہے اور کسی کے چھونے سے وہ موم کی طرح بوند بوند پگھلنے لگتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کا بھی دعویٰ کرتی تھی کہ اس نے کسی کو بھی حد سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ اپنی اس صفائی میں وہ بڑی سے بڑی قسمیں کھانے سے بھی گریز نہیں کرتی تو پھر یہ سب کیا تھا؟؟ اس سب کے بارے میں بڑی معصومیت سے نگینہ کا بس ایک ہی جواب ہوتا "میں تو کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی اب کوئی میرے لئے جان دے دے اور میں آنکھیں بند کئے رہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا دل بہت نرم ہے۔"

نگینہ کے کسی عاشق کی شادی ہوتی تو نگینہ اسے نہ صرف شادی کی اجازت دیتی بلکہ بیوی کے تئیں اسے تمام فرائض سے بھی آگاہ کرتی۔ آفتاب شادی سے ایک دن پہلے جب نگینہ سے ملنے آیا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ آفتاب نے نہ صرف اپنی سچی محبت کا یقین دلایا بلکہ ہمیشہ اس سے اسی طرح ملنے کا وعدہ بھی کیا۔

ہارون کے ساتھ بھی نگینہ کا عشق خوب چلا۔ نگینہ کے مکان کے ایک حصہ میں ہارون اور خورشیدہ کرائے پر رہتے تھے۔ دونوں میاں بیوی ایک جان دو قالب تھے۔ ایک مرتبہ نگینہ ان دونوں کے ساتھ آگرہ تاج محل دیکھنے چلی گئی۔ واپسی پر نگینہ تو بڑی خوش تھی لیکن خورشیدہ کے تیور بدلے ہوئے تھے کیونکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ممتاز محل دیکھنے کے بعد سے نگینہ ہارون کے دل کی ملکہ بن گئی ہے۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ میاں بیوی میں لڑائی ہوئی اور ہارون نے بیوی کو میکے پہنچا دیا۔ پھر جتنے منہ اتنی باتیں کھسر پسر ہونے لگیں۔ کچھ دنوں بعد نگینہ نے ہارون کو سمجھایا، منت سماجت کی کہ خورشیدہ کو لے آؤ۔ وہ نہیں مانا تو نگینہ نے اپنی محبت کا واسطہ دیا اور کہا کہ اگر مجھ سے ذرا سی بھی محبت ہے تو خورشیدہ کو منا کر لے آؤ۔ بس پھر کیا تھا

ہارون نے ایک سچے عاشق کی طرح نگینہ کی بات مان لی۔

اسی طرح کے کئی عشق آہستہ آہستہ زبان عام بن گئے۔ چچا چچی تو پہلے ہی جان چھڑا رہے تھے۔ اب اور موقع مل گیا۔ بھائی تو زندہ رہا نہیں پھر کیوں اس بدنامی کے ٹوکرے کو اپنے گھر اٹھا کر لائیں۔ ابرار کو رشتوں کی کیا کمی؟ ادھر ابرار بچپن کی اس منگیتر کو دیکھتا تو خون کے سے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔ نہ ماں باپ ہی اس کے دل کا حال سمجھتے تھے نہ نگینہ ہی پر اسے کوئی اختیار تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ نگینہ کی زندگی میں ایک کے بعد ایک کئی انقلاب آتے گئے۔ کبھی وہ کسی عاشق کے لئے روتی اور کبھی کسی کے لئے۔ اس کا ہر عاشق بھی اسی کے نام کا دم بھرتا تھا۔ ہر ایک کو یہ یقین تھا کہ نگینہ صرف اسی سے پیار کرتی ہے اور شادی بھی صرف اسی سے کرے گی۔ کئی مرتبہ حالات خطرناک صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ایسے میں نگینہ خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ کر آنکھیں موند لیتی تھی۔ جب سکوت چھا جاتا تو چپکے سے آنکھیں کھول دیتی پھر سب کچھ خود بہ خود نارمل ہو جاتا۔ لیکن اس مرتبہ معاملہ برعکس تھا۔ یہ شادی اس کے کسی عاشق کی نہیں اس کے بچپن کے منگیتر ابرار کی تھی۔ ابرار شادی کر رہا ہے--اس کو چھوڑ کر۔ اس کی اتنی بڑی توہین؟؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟؟ اس کے دل پر سانپ لوٹنے لگے۔

وہ یہ برداشت نہیں کر سکتی--- وہ ایسا کبھی نہیں ہونے دے گی-- کبھی نہیں--- کسی قیمت پر بھی نہیں۔

دوسرے دن آفس جاتے ہوئے ابرار کو نگینہ نے راستہ میں ہی روک لیا--- سارا دن وہ ابرار کے ساتھ نہ جانے کن کن جگہوں پر گھومتی پھری۔

اچھا ہی کیا ابرار جو تم نے مجھے چھوڑ دیا--اچھا ہی کیا--- کہ تم نے اپنی شادی طے کر لی۔ مجھے تو بس یہ کہنا تھا کہ تم بھی مجھے ویسا ہی سمجھتے ہو نہ جیسا کہ اور

دوسرے لوگ سمجھتے ہیں۔ وہ سسکنے لگی--- تمہارے انتظار میں ایک ایک پل میں نے کانٹوں پر گذارا ہے۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ تم میرے بغیر رہ سکو گے۔ میں ٹھہری جاہل گنوار--- تمہارے جذبات بھلا کیسے سمجھ سکتی ہوں---- تمہارے لئے تو خوبصورت پڑھی لکھی کسی بڑے گھرانے کی لڑکی ہی ٹھیک رہے گی----اچھا ہی کیا تم نے-----میں تمہیں پسند نہیں تو اپنی زندگی خراب کرنے سے کیا فائدہ---- پھر چچی اور چچا جان کے ارمان بھی تو-------میں غریب بھلا کیا ان کے ارمان پورے کروں گی------ تم خوش رہو---- آباد رہو--- بس اسی میں میری خوشی ہے۔ تم نے کوئی اچھی ہی لڑکی پسند کی ہو گی----میں تمہاری دلہن کو اپنے ہاتھوں سے سجا کر لاؤں گی------ بس تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا پڑے گا مجھے ہمیشہ کے لئے بالکل بھول جانا----اور اپنی ہونے والی بیوی کو کبھی کوئی غم نہ دینا۔ بس۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ابرار------میں تمہارے نام پر جیتی رہوں گی۔ یہ بات کسی کو پتہ نہیں چلے گی۔ ابرار حیران تھا---- کتنی غلط فہمیاں تھیں اسے----لوگوں نے کیسے کیسے کان بھر رکھے تھے اس کے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ نگینہ اسے مل گئی۔ ورنہ---------

چلو آنسو پونچھو اپنے------ رونا دھونا بند کرو--- پگلی--- بدھو کہیں کی---- میں بھلا تجھے چھوڑ کر کسی اور سے کیسے شادی کر سکتا ہوں--- بے وقوف----میں تو پہلے ہی سوچ رہا تھا یہ سب باتیں غلط ہیں۔ میری نگینہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی----تم میری ہو صرف میری---یہ نگینہ صرف میری انگوٹھی میں جڑا جائے گا۔ یہ کہتے ہوئے ابرار نے نگینہ کے گال پر زور سے چٹکی لی تو نگینہ اوئی اللہ کہہ کر چلا اٹھی۔

چلو اٹھو----چل کر شادی کی تیاریاں کرو۔

چچی جان اور چچا؟؟

وہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔

نگینہ کو یقین نہیں آ رہا تھا------یہ کیا ہو گیا؟

کیا واقعی وہ کامیاب ہو گئی ہے؟؟

یہی سوچ کر ابرار بھی پھولے نہیں سما رہا تھا کہ اس کا تیر کیسا نشانے پر لگا۔

☆☆☆

یل

"بیل"

رامو کاکا کی گائے دیکھتے ہی شاما کو اس پر پیار آنے لگتا۔ کتنی خوبصورت اور جوان تھی وہ۔ ایک دم چکنی چکنی، شاما دیکھتے ہی اس کی طرف لپکتی--اس پر ہاتھ پھیرتی--گائے بھی شاما سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ شاما کا ہاتھ اپنی پیٹھ پر محسوس کرتے ہی وہ اپنے کان ہلا کر دُم مٹکا کر اس کے پیار کا جواب دیتی۔ شاما اسے کبھی پوری کھلاتی کبھی پرانٹھا۔ جب شاما کو لگتا کہ اس سے اس کا دل بھر گیا ہے تو تازی تازی سبزی کے علاوہ چری کا گٹھر اس کے سامنے رکھ دیتی۔

شاما کو اس گھر میں بیاہ کر آئے ہوئے تین برس بیت گئے تھے۔ نہ ساس نہ نند، اس کے پتی ہری کے علاوہ اس کا سسر جنہیں سب رامو کاکا کہتے تھے اور بس یہ گائے، جو رامو کاکا کی دوسری سنتان تھی، شاما کے سامنے ہی پیدا ہوئی تھی۔ شاما کی تو دیورانی جٹھانی ساس جو بھی تھی بس یہی گائے تھی۔ رامو کاکا اور اس کا پتی صبح سویرے کھیت پر چلے جاتے تب بس شاما اور گائے اکیلے ہی رہ جاتے۔ شاما کو بھی سسرال میں سب سے اچھی یہ گائے لگتی تھی۔ کم از کم وہ اس کے اکیلے پن کی ساتھی تو تھی۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی کہ شاما رات کو جب بھی سونے لیٹتی تو اسے گائے کا خیال ضرور